غبار خاطر

مپرس تاچہ نوشتہ ہست کلکِ قاصرِ ما
خطِ غبارِ من است ایں غبارِ خاطرِ ما

غبارِ خاطر

یعنی

مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض مکاتیب جو اُنھوں نے قلعۂ احمد نگر کی قید کے زمانے میں بعض احباب کے نام لکھے تھے، اور جو مکتوب الیہ کو اُن کی رہائی کے بعد ملے۔ مولانا ۹۔ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو بمبئے میں گرفتار کرکے احمد نگر پہنچائے گئے، اور ۱۵ جون سنہ ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

حسن فروغ شمع سخن دور ہے
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کو

غبارِ خاطر

قلعۂ احمد نگر کی اسیری (از ۹۔ اگست ۱۹۴۲ء تا
۱۵۔ جون ۱۹۴۵ء) کے زمانے کی بعض تحریرات

از

ابوالکلام آزاد

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

= [illegible] شوق عنان گسیخته دریا بین صبر
[illegible] محتسبه من و یا عون مگر سبب بود
[illegible] از دل ضرب دو د بر دل [illegible]

غبارِ خاطر

آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور
میں باہتمام مولوی محمد احمد خاں پرنٹر پبلشر
شائع ہوا

مُطالعہ سے پہلے

آپ نے کتاب کی لوح اُلٹی ہے اور اب آپ کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ازراہِ عنایت چند منٹوں کے لیے رُک جائیے، اور طباعت کی چند غلطیاں جو رہ گئی ہیں، اُنھیں قلم سے دُرست کر لیجیے۔ آپ کو زحمت ہوگی لیکن اسے گوارا کر لیجیے۔ کیونکہ اِس طرح آپ اُس بے لطفی سے محفوظ ہو جائینگے جو غلطیوں کی موجودگی سے خود آپ کو اثناءِ مطالعہ میں پیش آنے والی ہے:

صفحہ ۳۳ سطر ۱۲۔ "مضطرب ہیں" کی جگہ "مضطرب رہیں" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۴۱ سطر ۳ "یہ نئی شرارت کی سوجھی ہے" کی جگہ "یہ نئی شرارت کیا سوجھی ہے" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۶۰ سطر ۴: انسان اپنی زندگی کے اندر" کی جگہ "انسان اپنی ایک زندگی کے اندر" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۶۹ سطر ۱۳۔ "۹۔ اگست کی صبح کے بعد سے دنبہ کا کیا حال ہوا" کی جگہ "۹ اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۷۷ سطر ۱۱۔ "زنداں بھی خیال بیاباں نورد تھا" کی جگہ "زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۸۰ سطر ۶۔ اور جلوت سے گریزاں رہتا" کی جگہ "اور جلوت سے گریزاں رہتا" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۸۲ - سطر ۲۔ "گردل کو" کی جگہ "مگر دل کو" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۸۸ - سطر ۱۔ "میرے ساتھ گئی تھیں" کی جگہ "میرے ساتھ آگئی تھیں" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۹۴ - سطر ۱۲۔ "قدرتی طور موسمی چیزوں کا" کی جگہ "قدرتی طور پر موسمی چیزوں کا" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۹۵ - سطر ۸۔ "ساش دشت زد شہر ودہ" کی جگہ "قماش دست زد شہر ودہ" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۹۷ سطر ۳۔ "اُنھیں تہ میں اُتر کر" کی جگہ "اور اُنھیں تہ میں اُتر کر" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۰۱ سطر ۴: "چودہ پندرہ برس سے آگے نہیں بڑھا" کی جگہ "چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں

صفحہ ۱۲۴ - سطر ۱۴۔ "ورنہ باگوشۂ باہیم سر وکارے نیست" کی جگہ "سر وکارے ہست" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۲۹ - سطر ۶۔ "مشخص تصور" اور "مشخص" کی جگہ "متشخص تصور" اور "متشخص" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۳۰ - سطر ۱۲۔ "مشکل" کی جگہ "متشکل" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۱۱ سطر ۶۔ "اور زیادہ اچھلنے لگتی ہے" کی جگہ "اچھلنے لگیگی" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۳۸ - سطر ۱۳۔ "ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر" کی جگہ "ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۷۵ سطر ۸۔ "اور میں پسند نہیں کرتا کہ ایسی خاموشی میں" کی جگہ
اس خاموشی" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۸۲ سطر ۱ "جیسے دماغ کا" کی جگہ "جسے دماغ کا ہونا" چاہیے۔

صفحہ ۲۸۳ سطر ۷۔ "یہاں ایک احاطہ کے اندر" کی جگہ "احاطہ کے اندر"
ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۸۸ سطر ۱۰۔ "جس سر و سامان کو" کی جگہ "جس بے سر و سامان
کو" ہونا چاہیے۔

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم :

تاریخِ واقعاتِ شہاں نانوشتہ اند
افسانۂ کہ گفت نظیری کتاب شد!

❖

اِس مجموعے میں جس قدر مکتوبات ہیں، وہ تمام تر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڈھ کے نام لکھے گئے تھے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی، اور حضرت مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جا سکتی تھی، اس لیے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے۔ ۱۵- جون ۱۹۴۵ء کو جب مولانا رہا ہوئے، تو ان مکاتیب کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کی راہ باز ہوئی۔

نواب صاحب سے حضرت مولانا کا دوستانہ علاقہ بہت قدیم ہے۔ مولانا نے خود ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ پہلے پہل اُن سے ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی گویا ایک کم چالیس برس اس رشتۂ اخلاص و محبت پر گزر چکے، اور ایک قرن سے بھی زیادہ وقت کا امتداد اس کی تازگی اور شگفتگی کو افسردہ نہ کر سکا۔ دوستی و یگانگت کے ایسے ہی علائق ہیں، جن کی نسبت کہا گیا تھا :

تزول جبال الراسیات و قلبھم
عن الحبّ لا یخلوا ولا یتزلزل!

البتہ یہ علاقہ محبت واخلاص صرف علمی اور ادبی ذوق کے رشتۂ اشتراک میں محدود ہے۔ سیاسی عقائد واعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سیاسی میدان میں مولانا کی دوسری راہ ہے، اور نواب صاحب اس سے رسم و راہ نہیں رکھتے۔

حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں، مقرر بھی ہیں، مفکر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، مدبّر بھی ہیں، اور ساتھ ہی سیاسی جدوجہد کے میدان کے سپہ سالار بھی ہیں۔ دینی علوم کے تبحّر کے ساتھ عقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے، اور علم اور ادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے۔ پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان، عملی سیاست کی جدوجہد سے اتنا دُور واقع ہوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اُٹھ سکے ہیں۔ مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے۔ گویا ان کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہو گئی ہیں:

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں!

اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے علائق کا دائرہ کسی ایک گوشے ہی میں محدود نہیں ہے۔ علوم دینیہ کے حجروں کے زاویہ نشین، ادب و شعر کی محفلوں

کے بزم طرازِ علم اور فلسفے کی کاوشوں کے دقیقہ سنج، اور میدانِ سیاست کے تدبّر اور معرکہ آرائیوں کے شہ سوار، سب کے لیے ان کی شخصیت یکساں طور پر کشش رکھتی ہے، اور سب اس مجمع فضل و کمال کے افادات سے بقدرِ طلب و حوصلہ مستفید ہوتے رہتے ہیں:

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند!

البتہ ان کے ارادت مندوں کا حلقہ جس قدر وسیع اور بین القومی ہے، اُتنا ہی دوستوں کا دائرہ تنگ ہے:

کسے کہ زود گُسل نیست، دیر پیوندست!

ایسے خوش قسمت اصحاب جنھیں مولانا اپنے "دوستوں" میں تصور کرتے ہوں خال خال ہیں، اور صرف وہی ہیں جن سے علم و ذوق کے اشتراک، اور رجحانِ طبیعت کی مناسبت نے انہیں وابستہ کر دیا ہے۔ ایسے ہی خال خال حضرات میں ایک شخصیت نواب صدر یار جنگ کی ہے۔

نواب صاحب مسلمانانِ ہند کے گزشتہ دورِ علم و مجالس کی یادگار ہیں آج سے تیس ۳۰ چالیس ۴۰ برس پیشتر کا زمانہ، مولانا آزاد کی ابتدائی علمی زندگی کا زمانہ تھا۔ وہ اُس وقت کے تمام اکابر و افاضل سے عمر میں بہت چھوٹے تھے یعنی ان کی عمر سترہ ۱۷ اٹھارہ ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت، اور محیّر العقول

علمی قابلیت کی وجہ سے سب کی نظروں میں محترم ہو گئے تھے، اور معاصرانہ اور دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ حکیم محمد اجمل خاں وغیرہم، سب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اور علمی اور ادبی صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ اسی عہد کی صحبتوں میں نواب صدر یار جنگ سے بھی ان کی شناسائی ہوئی، اور پھر شناسائی نے عمر بھر کی دوستی کی نوعیت پیدا کرلی۔ مولانا اس رشتے کو خصوصیت کے ساتھ عزیز رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ اُس عہد کی یادگار ہے، جو بہت تیزی کے ساتھ گزر گیا، اور ملک کی مجلسیں قدیم صورتوں اور صحبتوں سے یک قلم خالی ہوگئیں۔

مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث اُن کی تمام دوسری حیثیتوں پر چھاگئے ہیں۔ لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے بالکل الگ رکھا ہے۔ جن دوستوں سے ان کا علاقہ محض علم و ادب کے ذوق کا علاقہ ہے، وہ ان کے علائق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے ہیں، اور اس طرح الگ رکھتے ہیں، گویا ان کی زندگی میں سیاسی افکار و اعمال کا کوئی گوشہ سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا۔ وہ اپنی سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی علمی زندگی پر پڑنے نہیں دینگے۔ وہ جب کبھی ان دوستوں سے ملیں گے، یا خط وکتابت کرینگے، تو اس میں سیاسی افکار و اعمال کا کوئی

ذکر نہ ہوگا۔ ایک بے خبر آدمی اگر اُس وقت کی باتوں کو سُنے، تو خیال کرے، کہ اس شخص کو سیاسی دنیا سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے، اور علم و ادب کے سوا اَور کسی ذوق سے آشنا نہیں۔ ایک مرتبہ اس معاملے کا خود مولانا سے ذکر ہوا تو فرمانے لگے۔ جس شخص سے میرا تعلق جس حیثیت سے ہے، میں ہمیشہ اُسے اُسی حیثیت میں محصور اور محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دوسری حیثیتوں سے اُسے آلودہ کروں۔ چنانچہ نہ تو کبھی وہ ان دوستوں سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ اُن کی سیاسی زندگی کے آلام و مصائب میں شریک ہوں، نہ کبھی اس کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار و اعمال سے اتفاق کریں۔ سیاسی معاملے میں وہ ہر شخص کو خود اُس کی پسند اور خواہش پر چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ اُن سے کسی علمی، مذہبی اور ادبی تعلق سے برسوں ملتے رہیے۔ وہ کبھی بھولے سے بھی سیاسی معاملات کا آپ سے ذکر نہیں کرینگے۔ ایسا معلوم ہوگا، جیسے اس عالم کی اُنہیں کوئی خبر ہی نہیں!

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی سیاسی میدانوں کے طوفانی حوادث سے گھری ہوتی ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک دن یا ایک گھنٹے کے بعد کیا حوادث پیش آئینگے۔ ممکن ہے کہ قید و بند کا مرحلہ پیش آجائے۔ بہت ممکن ہے کہ جلاوطنی، یا اس سے بھی زیادہ کوئی خطرناک صورتِ حال ہو۔ لیکن اچانک، عین اسی عالم میں کسی ہم ذوق دوست کی یاد اُن

کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے، اور وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے سارے گرد وپیش سے یک قلم کنارہ کش ہوکر اس کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس استغراق اور انہماک کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں، گویا اُن کی زندگی پر کسی خطرناک حادثے کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے، اور پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ اپنے ذوق وکیف میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ اُس وقت اپنی یکسانی اور بے کیف سیاسی مشغولیّت کا مزہ بدلنے کے لیے کوئی ایسا موضوع چھیڑ دینگے، جو سیاسی زندگی کے میدانوں سے ہزاروں کوس دور ہوگا۔ علم وفن کا کوئی مبحث، فلسفیانہ غور وفکر کی کوئی کاوش، طبعیّات کا کوئی نیا نظریہ، تصوف واشراق کا کوئی واردہ، یا پھر ادب وانشا کی سخن طرازی اور شعروسخن کی بزم آرائی، غرض کہ سیاست کے سوا ہر ذوق کی وہاں گنجائش ہوگی، ہر وادی کی وہاں پیمائش کی جاسکیگی۔ اُس وقت کوئی اُنھیں دیکھے تو صاف دکھائی دے کہ زبانِ حال سے خواجہ حافظ کا یہ شعر دُہرا رہے ہیں:

کمند صید بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام ست نے گورش!

مولانا اس صورتِ حال کو "تحمیض" سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ "تحمیض" عربی میں منہ کا مزہ بدلنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ "حمضوا مجالسکم" یعنی اپنی مجلسوں کا مزہ بدلتے رہو۔ وہ کہتے ہیں، اگر گاہ گاہ میں اس تحمیض کا موقع نہ نکالتا رہوں

تو میرا دماغ بے کیف اور خشک مشغولیتوں کے بارِ مسلسل سے تھک کر معطّل ہو جائے۔ اس طرح کی "تحمیض" میرے لیے ذہنی عیش و نشاط کا سامان بہم کردیا کرتی ہے، اور دماغ ازسرِ نو تازہ دم ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین سیاسی طوفانوں کے موسم میں کوئی ہم ذوق دوست آنکلتا ہے اور انہیں موقع مِل جاتا ہے کہ قلم و تخیّل کی جگہ صحبت و مجالست کے ذریعہ اپنی مشغولیت کا ذائقہ بدلیں۔ وہ معاً اپنے گرد و پیش کی دنیا سے باہر نکل آئینگے، اور ایک انقلابی تحوّل کے ساتھ اپنے آپ کو ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دینگے۔ وہ فوراً اپنے خادمِ خاص عبداللہ کو پکارینگے کہ چائے لاؤ۔ یہ گویا اس کا اعلان ہوگا کہ ان کا خاص وقت آگیا۔ پھر شعر و سخن کی صحبت شروع ہو جائیگی، علم و ادب کا مذاکرہ ہونے لگیگا، اور اعلیٰ درجہ کی چینی چائے "وھائٹ جسامِن" کے چھوٹے چھوٹے فنجانوں کا دور چلنے لگیگا کہ

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست!

اُنہیں اپنی طبیعت کے انفعالات پر غالب آنے، اور اپنے آپ کو اچانک بدل لینے کی جو غیرمعمولی قدرت حاصل ہوگئی ہے، وہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں

خود اپنی آنکھوں سے اس انقلابی تحوّل کو دیکھنے کا موقع ملا ہو مجھے آٹھ برس سے یہ موقع حاصل ہے۔

نواب صدر یار جنگ ایک خاندانی رئیس ہیں۔ ملک کے سیاسی معاملات میں اُن کا طرزِ عمل وہی رہتا آیا ہے جو عموماً ملک کے طبقہ رُوسا کا ہے یعنی سیاسی کشمکش کے میدانوں سے علیحدگی اور اپنے گوشۂ سکون وجمعیت پر قناعت۔ برخلاف اس کے مولانا کی پوری زندگی سیاسی جدوجہد کی جنگ آزمائی اور معرکہ آرائی کی زندگی ہے۔ لیکن صورتِ حال کا یہ اختلاف بلکہ تضاد، ایک لمحے کے لیے بھی ان کے باہمی علائق کی یگانگت ویک جہتی پر اثر نہیں ڈال سکتا۔ نہ کبھی مولانا سیاسی معاملات کی طرف کوئی اشارہ کرینگے، نہ کبھی نواب صاحب کی جانب سے کوئی ایسا تذکرہ درمیان آئے گا۔ دونوں کا علاقہ ذاتی محبت و اخلاص اور ذوقِ علم و ادب کے اشتراک کا علاقہ ہے۔ اور ہمیشہ اسی دائرے میں محدود رہتا ہے۔ چنانچہ قلعہ احمد نگر کے ایک مکتوب مؤرخہ ۲۹۔ اگست ۴۳ء میں وہ سیاسی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اِن معاملات کے لیے نہیں ہُوا کرتی:

ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

میری دُکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی، لیکن آپ کے لیے کچھ

نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے"۔

۱۵- جون ۱۹۴۵ء کو مولانا تین برس کی قید و بند کے بعد رہا ہوئے، لیکن رہائی کے بعد ہی اُنھیں فوراً شملہ پہنچنا، اور شملہ کانفرنس کی مشغولیتوں میں گم ہو جانا پڑا۔ اب وہ قلعۂ احمد نگر اور بانکوڑا کے قید خانے کی جگہ وائسرائگل لاج شملہ کے مہمان تھے۔ لیکن یہاں بھی صبح چار بجے کی سحر خیزی اور خود مشغولی کی معمولات برابر جاری رہیں۔ ایک دن صبح اچانک نواب صاحب کی یاد سامنے آجاتی ہے، اور وہ ایک شعر لکھ کر تین برس پیشتر کی خط وکتابت کا سلسلہ ازسرِنو تازہ کر دیتے ہیں۔ پھر تبدیلِ آب وہوا کے لیے کشمیر جاتے ہیں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہاؤس بوٹ نسیم باغ کے کنارے لگا دیا گیا تھا، اور مولانا کی صبحیں اسی کے ڈرائنگ روم میں بسر ہونے لگی تھیں یہاں پھر خط وکتابت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور ۳- ستمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا اپنے ایک مکتوب میں قلعۂ احمد نگر کے حالات کی حکایت چھیڑ دیتے ہیں، اور ان مکاتیب کی نگارش کے اسباب و محرکات کی تفصیلات لکھتے ہیں جو اس مجموعے میں جمع کیے گئے ہیں۔ چونکہ رہائی کے بعد کے مکاتیب کا یہ حصہ بھی ان مکاتیب سے مربوط ہو گیا ہے، اس لیے مولانا سے اجازت لے کر، میں نے اُنھیں بھی اس مجموعے کی ابتدا میں شامل کر دیا ہے۔ رہائی کے بعد کے یہ مکاتیب اس مجموعے کے لیے

دیباچے کا کام دینگے۔

مولانا کو سیکڑوں خطوط لکھنے اور لکھوانے پڑتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی نقول نہیں رکھی جاسکتیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اُنھوں نے اپنے خاص علمی اور ادبی مکاتیب کی نقول رکھنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی اور اس طرح سیکڑوں مکاتیب ضائع گئے۔

سنہ ۴۰ء میں، میں نے مولانا سے درخواست کی کہ جو خاص مکاتیب وہ دوستانِ خاص کو لکھا کرتے ہیں، اُن کی نقول رکھنے کی مجھے اجازت ملے۔ چنانچہ مولانا نے اجازت دے دی، اور اب ایسا ہونے لگا کہ جب کبھی مولانا کوئی مکتوبِ خاص اپنے ذوق و کیف میں لکھتے، میں پہلے اُس کی نقل کرلیتا، پھر ڈاک میں ڈالتا۔ نواب صاحب کے نام سنہ ۴۰ء اور ۴۲ء میں جس قدر خطوط لکھے گئے، سب کی نقول میں نے رکھ لی تھیں اور میرے پاس موجود ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد مولانا نے قلعۂ احمد نگر کے مکاتیب میرے حوالے کیے کہ حسب معمول ان کی نقول رکھ لوں، اور اصل نواب صاحب کی خدمت میں بہ یک دفعہ بھیج دوں۔ لیکن میں نے جب ان کا مطالعہ کیا تو خیال ہوا، کہ اِن تحریرات کا محض نج کے خطوط کی شکل میں رہنا اور شائع نہ ہونا، اردو ادب کی بہت بڑی محرومی اور اربابِ ذوق کی ناقابلِ تلافی حرمانی ہوگی۔ مولانا اُس وقت شملہ میں تھے۔ میں نے بہ اصرار اُن سے درخواست کی کہ ان مکاتیب کو ایک مجموعے

کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دے دیں مجھے یقین ہے کہ ملک کے تمام اربابِ ذوق و نظر اس واقعے کے شکر گزار ہونگے کہ مولانا نے اشاعت کی اجازت دے دی، اور اس طرح میں اس قابل ہوگیا کہ یہ مجموعہ دیدہ ورانِ علم و ادب کی ضیافت ذوق کے لیے پیش کروں۔

۱۹۴۲ء میں گرفتاری سے پہلے مولانا لاہور گئے تھے۔ وہاں انفلوئنزا کی شکایت لاحق ہوگئی تھی۔ اسی حالت میں کلکتے آئے اور صرف تین دن ٹھہر کر ۲۔ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت کرنے کے لیے بمبئی روانہ ہوگئے۔ بمبئی جاتے ہوئے ریل میں اُنھوں نے ایک مکتوب نواب صاحب کے نام لکھ کر رکھ لیا تھا کہ بمبئی پہنچ کر مجھے دے دینگے، میں حسب معمول اُس کی نقل رکھ کر اصل ڈاک میں ڈال دونگا۔ لیکن بمبئی پہنچنے کے بعد وہ اپنی مصروفیتوں میں غرق ہوگئے اور مکتوبِ سفر اُن کے اٹاچی کیس میں پڑا رہ گیا۔ یہاں تک کہ ۹۔ اگست کی صبح کو وہ گرفتار ہوگئے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اُس خط کا ذکر آیا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اُسے بھی ابتدا میں شامل کردیا جائے۔ چنانچہ وہ شامل کردیا گیا ہے۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ مولانا کے اسلوب نگارش (سٹائل) کی نسبت اپنے تأثرات کے اظہار کی جرأت کرونگا، لیکن جب اس اِرادے کو عمل میں لانے کے لیے تیار ہوا، تو معلوم ہوا کہ خاموشی کے سوا چارۂ کار نہیں۔ کیونکہ جتنا کچھ اور

جیسا کچھ لکھنا چاہیے، اس کی یہاں گنجائش نہیں، اور جس قدر لکھنے کی گنجائش ہے، وہ اظہارِ تاثرات کے لیے کافی نہیں۔ صرف اتنا اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ فرانسیسی ادبیات میں ادب کی جس نوعیت کو "ادب اعلیٰ" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر اردو ادب میں اس کی کوئی مثال ہمیں مل سکتی ہے، تو وہ صرف مولانا کی ادبیات ہیں۔

مولانا نے اپنے اسلوبِ نگارش کے مختلف ڈھنگ رکھے ہیں، کیونکہ ہر موضوع ایک خاص طرح کا اسلوب چاہتا ہے۔ اور اُسی اسلوب میں اُس کا رنگ اُبھر سکتا ہے۔ دینی مباحث کے لیے جو اسلوبِ تحریر موزوں ہوگا، تاریخ کے لیے موزوں نہ ہوگا۔ تاریخی مباحث جس طرز کتابت کے متقاضی ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ ادبی نگارشات کے لیے بھی وہ موزوں ہو۔ عام حالت یہ ہے، کہ ہر شخص ایک خاص طرح کا اسلوب تحریر اختیار کر لیتا ہے، اور پھر جو لکھتا ہے، اُسی رنگ میں لکھتا ہے۔ لیکن مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے علم و ذوق کے تنوّع کی طرح اپنا اسلوب تحریر بھی مختلف قسموں کا رکھا ہے۔ عام دینی اور علمی مطالب کو وہ ایک خاص طرح کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ صحافت نگاری کے لیے اُنہوں نے ایک دوسرا اسلوب اختیار کیا ہے، اور خالص ادبی انشا پردازی کے لیے ان دونوں سے الگ طریقِ نگارش ہے۔

جس زمانے میں "الہلال" نکلا کرتا تھا، تو اُس میں کبھی کبھی وہ خالص ادبی قسم کی چیزیں بھی لکھا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں اُنہوں نے ایک ایسا مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا تھا، جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کے سامنے موجود نہ تھی۔ اس اسلوب کے لیے اگر کوئی تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔ تو وہ صرف "شعر منثور" کی ہے۔ یعنی وہ نثر میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریر از سرتاپا شعر ہوتی تھی۔ صرف ایک چیز اس میں نہیں ہوتی تھی، یعنی وزن۔ اور اس لیے اسے نظم کی جگہ نثر کہنا پڑتا تھا۔

اس طرزِ تحریر کا ایک خاص طریقہ یہ تھا، کہ وہ اپنی نثر کی شاعری کو شعراء کی نظم کی شاعری سے مخلوط و مربوط کر کے ترتیب دیتے تھے۔ اور یہ اختلاط اور ارتباط اس طرح وجود میں آتا تھا کہ اشعار صرف مطالب کی مناسبت ہی سے نہیں آتے، بلکہ بجائے خود مطالب کا ایک جزء بن جاتے تھے۔ ایسا جزء، کہ اگر اُسے الگ کر دیجیے تو خود نفس مطلب کا ایک ضروری اور لاینفک جزء الگ ہو جائے۔ اکثر حالتوں میں مطالب کا سلسلہ اس طرح پھیلتا تھا کہ پورا مضمون نثر کے چھوٹے چھوٹے پیراگرافوں سے مرکب ہوتا، اور ہر پیراگراف کسی ایک شعر پر ختم ہوتا۔ یہ شعر، نثر کے مطلب سے ٹھیک اسی طرح جڑا ہوا اور بندھا ہوا ہوتا، جس طرح ایک ترکیب بند کا ہر بند ٹیپ کے کسی شعر سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ شعر بند کا ایک ضروری جزء بن جاتا ہے۔

لوگ نثر میں اشعار لاتے ہیں، تو عموماً اس طرح لاتے ہیں کہ کسی جزئی مناسبت سے کوئی شعر یاد آگیا اور کسی خاص محل میں درج کر دیا گیا۔ لیکن مولانا اس قسم کی تحریرات میں جو شعر درج کرینگے، اس کی مناسبت محض جزئی مناسبت نہ ہوگی، بلکہ مضمون کا ایک ٹکڑا بن جائیگی، گویا خاص اسی محل کے لیے شاعر نے یہ شعر کہا ہے، اور مطلب کا تقاضا پورا کرنے اور ادھوری بات کو مکمل کر دینے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس طرزِ تحریر پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے، جو کامل درجے کا شاعرانہ فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ، اساتذہ کے بے شمار اشعار بھی اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا ہو، اور مطالب کی ہر قسم اور ہر نوعیت کے لیے جس طرح کے اشعار بھی مطلوب ہوں، فوراً حافظہ سے نکال لے سکتا ہو۔ پھر ساتھ ہی اس کا ذوق بھی اس درجہ سلیم او بے داغ ہو کہ صرف اعلیٰ درجے کے اشعار ہی حافظہ قبول کرے، اور حسنِ انتخاب کا معیار کسی حال میں بھی درجہ سے نہ گرے۔ اس اعتبار سے مولانا کے حافظے کا جو حال ہے، وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ قدرت نے انہیں جو خصائص بخشے ہیں، شاید ان سب میں حافظے کی نعمتِ لازوال سب سے بڑی نعمت ہے۔ عربی، فارسی، اور اُردو کے کتنے اشعار ان کے حافظے میں محفوظ ہونگے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ غالباً خود انہیں بھی معلوم نہیں۔ لیکن جوں ہی وہ قلم اُٹھاتے ہیں اور مطالب کی مناسبتیں اُبھرنے لگتی ہیں، معاً اُن کے حافظے کے بند کواڑ کھلنے شروع ہو جاتے ہیں، اور پھر ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم اور ہر نوعیت کے سیکڑوں شعر پرا باندھے سامنے کھڑے ہیں۔ جس شعر کی جس جگہ ضرورت ہوئی، فوراً اُسے نکالا اور انگوٹھی کے نگینے کی طرح مضمون میں جڑ دیا!

عام علمی اور دینی مباحث کی تحریرات میں مولانا بہت کم اشعار لایا کرتے ہیں۔ صفحوں کے صفحے لکھ جائینگے اور ایک شعر بھی نہیں آئیگا۔ لیکن اس خاص اسلوبِ تحریر میں وہ اس کثرت کے ساتھ اشعار سے کام لیتے ہیں کہ ہر دوسری تیسری سطر کے بعد ایک شعر ضرور آجاتا ہے، اور مطلب کے حُسنِ دل آویزی کا ایک نیا پیکر نمایاں کر دیتا ہے۔

قلعہ احمد نگر کے اکثر مکاتیب اسی طرزِ تحریر میں لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے نثر میں شاعری کی ہے، اور جس مطلب کو ادا کیا ہے، اس طرح کیا ہے، کہ جدتِ فکر نقش آرائی کر رہی ہے، اور وسعتِ تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔ اجتہادِ فکر اور تجدیدِ اسلوب مولانا کی عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ قلم اور زبان کے ہر گوشے میں، وہ طرزِ عام سے اپنی روش الگ رکھینگے اور الفاظ و تراکیب سے لے کر مطالب اور ادائے مطالب کے طرز تک، ہر بات میں تقلیدِ عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ انداز میں بے میل اور بے لچک نظر آئینگے۔ انھوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہے ہمیشہ پیش رو اور صاحبِ اسلوب رہے ہیں۔ کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی دوسرے پیش رو کے نقشِ قدم پر چلیں چنانچہ

ان مکاتیب میں بھی ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، لیکن قدرتِ بیان ہے جو بے ساختگی میں بھی اُبھری چلی آتی ہے، اور کاوشِ فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے!

ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے، واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی کا جواب نہیں۔ فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔

اِن مکاتیب پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے زیادہ اہم چیز جو سامنے آتی ہے، وہ مولانا کا دماغی پس منظر (بیک گراؤنڈ) ہے۔ اسی پس منظر پر افکار و احساسات کی تمام جلوہ طرازیوں نے اپنی جگہ بنائی ہے۔ ایک شخص ۹۔ اگست کی صبح کو بستر سے اُٹھا، تو اچانک اُسے معلوم ہوا کہ وہ گرفتار شدہ قیدی ہے، اور کسی لامعلوم مقام پر لے جایا جا رہا ہے۔ پھر ایک ایسی شدید فوجی نگرانی کے اندر، جس کی کوئی پچھلی مثال ہندوستان کی سیاسی جد و جہد کی تاریخ میں موجود نہیں، اسے قلعۂ احمد نگر کی ایک عمارت میں بند کر دیا جاتا ہے اور دنیا سے تمام علائق یک قلم منقطع ہو جاتے ہیں۔ وہ اِس حادثہ کے چوبیس گھنٹے کے بعد دوسری صبح کو اُٹھتا ہے، اور قلم اُٹھا کر خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن حالات کی تحریک، خیالات میں جنبش پیدا کرتی رہتی

ہے، اور جو کچھ دماغ میں اُبھرتا ہے، بلا روک نوکِ قلم کے حوالے ہو جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسے حوصلہ فرسا حالات میں ان کا دماغی پس منظر کیا تھا، اور وقت کے تمام مخالفانہ حالات کو کس نظر اور کس مقام سے دیکھ رہا تھا؟ یہی دماغی پس منظر ہے جس کی نوعیت سے ہر عظیم شخصیت کی عظمت کا اصلی مقام دنیا کے آگے نمایاں ہوتا ہے۔ یہی کسوٹی ہے جس پر ہر انسانی عظمت کسی جاسکتی ہے، اور یہی معیار ہے، جو ہر انسان کی عظمت و پستی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

اِن مکاتیب میں مولانا نے خود کوشش کی ہے کہ اپنا دماغی پس منظر دنیا کے آگے رکھ دیں، اور اسی لیے یہ غیر ضروری ہو گیا ہے کہ اس بارے میں بحث و نظر سے کام لیا جائے۔ میں صرف معاملے کے اس پہلو پر اہلِ نظر کو توجہ دلانا چاہتا ہوں خود کچھ کہنا نہیں چاہتا

گزشتہ جولائی میں جونہی ان مکاتیب کی اشاعت کا اعلان ہوا، ملک کے ہر گوشے سے تقاضے ہونے لگے کہ ان کے ترجمے کا بھی سروسامان ہونا چاہیے۔ کلکتہ، بمبئی، دہلی، الہ آباد، کانپور اور پٹنہ کے پبلشروں کا تقاضا تھا کہ انگریزی، ہندی، گجراتی، بنگالی، تامل وغیرہ زبانوں میں ان کے ترجمے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے یہ تمام درخواستیں مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں، لیکن اُنھوں نے ترجمے کی اجازت نہیں دی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ چند مکاتیب کے سوا یہ تمام مکاتیب ایک ایسے اسلوب میں لکھے گئے ہیں کہ ان کا کسی

دوسری زبان میں صحتِ ذوق و معیار کے ساتھ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کیا جائیگا تو اصل کی ساری خصوصیات مٹ جائینگی۔ چنانچہ اس وقت تک ترجمے کی اجازت کسی فرم کو نہیں دی گئی ہے۔ مولانا نے جس خیال سے ترجمے کو روکا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے ہر صاحبِ نظر اتفاق کریگا۔ یہ نثر میں شاعری ہے، اور شاعری ترجمے کی چیز نہیں ہوتی۔ البتہ دو چار مکتوب جو بعض فلسفیانہ اور تاریخی مباحث پر لکھے گئے ہیں، ترجمہ کیے جا سکتے ہیں۔ اُنہیں مستثنیٰ کر دینا چاہیے۔

یہ تمام مکاتیب "صدیقِ مکرّم" کے خطاب سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ "صدیق" تشدید کے ساتھ "صدّیق" نہیں ہے، جیسا کہ بعض اشخاص پڑھنا چاہینگے، بلکہ بغیر تشدید کے ہے۔ "صداقہ" عربی میں دوستی کو کہتے ہیں "صَدِیق" یعنی دوست۔

۱۱۔ اپریل ۱۹۴۳ء کے مکتوب کے آخر میں متمّم بن نویرہ کے مرثیے کے اشعار نقل کیے گئے ہیں (ص ۲۸۳) یہ مرثیہ اُس نے اپنے بھائی مالک کی یاد میں لکھا تھا:

"لقد لامنی عند القبور علی البُکا — رفیقی لتذراف الدموع السوافك
فقال أتبکی کل قبرٍ رأیتہ — لقبرٍ ثوی بین اللوی فالدکادك
فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا — فدعنی۔ فھذا کلہ قبر مالك!"

ان اشعار کے مطلب کا خلاصہ یہ ہے:

"میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں تو اُس نے مجھے ملامت کی۔ اُس نے کہا یہ کیا بات ہے کہ اُس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے، تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا، بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کو تازہ کر دیا کرتا ہے، لہذا مجھے رونے دے۔ میرے لیے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں!"

"حکایت بے ستون و کوہ کن" ایران کے قدیم آثار میں ایک اثر "بے ستون" کے نام سے مشہور ہے، اور داستان سراؤں نے اسے فرہاد کوہ کن کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مگر دراصل یہ "بے ستون" نہیں ہے، "بہ ستون" (بہستان یا باغستان) ہے۔ فارسی قدیم میں "باغ" خدا یا دیوتا کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ مقام "خداؤں کی جگہ" ہے۔

محمد اجمل خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم:

دیباچہ

میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصر اور ہم وطن تھے، اور جدی رشتہ سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکروں میں جابجا ان کا ترجمہ لکھا ہے، اور سراج الدین علی خاں آرزو اور آنند رام مخلص کی تحریرات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ اُنھوں نے ایک مختصر سا رسالہ "غبارِ خاطر" کے نام سے لکھا تھا۔ میں یہ نام اُن سے مستعار لیتا ہوں:

مپرس تا چہ نوشت ست کلکِ قاصرِ ما
خطِ غبارِ من ست ایں غبارِ خاطرِ ما!

یہ تمام مکاتیب نج کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائینگے۔ لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خاں صاحب کو ان کا علم ہوا تو مُصر ہوئے کہ اُنھیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چونکہ اُن کی طرح اُن کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے

اس لیے اِن مکاتیب کی اشاعت کا سروسامان کر رہا ہوں جس حالت میں یہ قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے، اُسی حالت میں طباعت کے لیے دے دیے گئے ہیں۔ نظرثانی کا موقع نہیں ملا:

نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگزارید کہ ایں نسخہ مُجزّا ماند!

نیشنل ایرلائن
۲۔فروری ۴۶ء
مابین کراچی۔جودھپور

ابوالکلام

رہائی کے بعد کے بعض مکاتیب نواب صدر یار جنگ کے نام

شملہ

۲۷۔ جون سنہ ۴۵ء

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیان و دعا می فرستمت

دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبانِ درماندۂ فرصت کو یارائے سخن نہیں۔ مہلت کا منتظر ہوں۔

ابوالکلام

نواب صدر یار جنگ کا مکتوب

حبیب گنج (علی گڈھ)

۱۔ جولائی سنہ ۴۵ء

صدیق حبیب!

جس دن بدرِ کامل گہن سے نکلا تھا، دل نے محسوس کیا تھا کہ نورِ عظمت

جہاں تاب ہوگا۔ ہوا، اور کس شان سے ہوا۔ ۲۷ جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ایک ہنگامہ ایک گروپ کی شکل میں سامنے آیا۔ اُس میں ایک پیکرِ محبوب بھی تھی قینچی لی۔ مجمع اغیار سے اُسے جُدا کیا۔ دیکھا۔ شیراز کی طرف سے صدا آئی:

روشن از پرتوِ رویت نظرے نیست کہ نیست
منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست!

اس غزل کا ایک اور شعر شاید بے موقع نہ ہو:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں اُفتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست!

خیر یہ تو ترانۂ شیراز تھا۔ کان لگاتا ہوں تو شملہ کی چوٹیوں سے دوسرا ترانۂ محبت سامعہ نواز ہو رہا ہے:

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیان و دعا می فرستمت!

جو کان نے سُنا، تیسرے دن نقوشِ دل افروز کے پردے پر آنکھوں نے دیکھ لیا۔ اجازت ہو تو دوسرا مصرعہ میں بھی دُہرادوں:

می بینمت عیان و دعا می فرستمت!

نیاز کیش۔ حبیب الرحمٰن

نوابِ صدر یار جنگ کا نامۂ منظوم

جیب گنج (علی گڑھ)

۶۔ رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۴ھ

محو نظارۂ گلمرغ[1] نگارے دارم
کز خیالش بہ دل زار بہارے دارم

اے نسیمِ سحری گر بحضورش گزری
عرضہ دہ شوق کہ در جانِ فگارے دارم

ور بپرسد کہ مگر شوقِ پیامم دارد؟
سر فرود آر و زمن گوئے کہ آرے، دارم!

دوردستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت است

ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند

اسیر آزاد

جیب

[1] کشمیر کی پہاڑی سطحِ مرتفع گلمرگ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اصل میں گل مرغ ہوگا۔ "مرغ" وہی لفظ ہے جو مرغزار میں ہے۔

مولانا کا مکتوب سری نگر

ہاؤس بوٹ۔ سری نگر

۲۴۔ اگست ۱۹۴۵ء

گہے از دست، گاہے از دل، وگاہے ز پا مانم
بہ سرعت می روی اے عمر! می ترسم کہ وا مانم!

صدیقِ مکرم

زندگی کے بازار میں جنس مقاصد کی بہت سی جستجوئیں کی تھیں، لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں یعنے اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈھ رہا ہوں۔ معالجوں نے وادیِ کشمیر کے گل گشتوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ گزشتہ ماہ کے اواخر میں گلمرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سُراغ پا سکونگا، مگر ہر چند جستجو کی، متاعِ گم گشتہ کا کوئی سُراغ نہیں ملا:

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضی نے کبھی بارِ عیش کھولا تھا:

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن میرے حصے میں ناخوشی و علالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پر

اُٹھائے آیا تھا، اُسی طرح اُٹھائے واپس جا رہا ہوں۔ خود زندگی بھی سر تا سر ایک بوجھ ہی ہے۔ خوشی سے اُٹھائیں یا ناخوشی سے، مگر جب تک بوجھ سر پر پڑ گیا ہے، اُٹھانا ہی پڑتا ہے:

مازندہ ازانیم کہ آرام نہ گیریم!

گلمرگ سے سری نگر آ گیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوبِ منظوم حوالہ کیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس پیامِ محبت کو دلِ دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سُنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے جو غالب نے کہا تھا:

باچوں توئی معاملہ، بر خویش منت ست
از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم!!

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیامِ دلنواز نہیں بھیجا ہے۔ لطف و عنایت کا ایک پورا دفتر کھول دیا ہے:

قلیلٌ منکَ یکفینی، ولٰکن
قلیلکَ لا یقالُ لہٗ قلیل!

اِن سطور کو آئندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصور کیجیے۔ رہائی کے بعد جو کہانی سنانی تھی، وہ ابھی تک نوکِ قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

وبرکاتہٗ

ابوالکلام

مکتوبِ نسیم باغ

نسیم باغ۔ سری نگر

۳۔ ستمبر ۱۹۴۵ء

از ما مپرس دردِ دلِ ما، کہ یک زماں
خود را بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم

صدیقِ مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ داہنی طرف جھیل کی وسعت شالامار اور نشاط باغ تک پھیلتی گئی ہے۔ بائیں طرف نسیم باغ کے چناروں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں:

گرچہ دوریم، بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی!

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا، وہ ۳۔ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ بمبئی

پہنچ کر اجمل خانصاحب کے حوالے کرونگا۔ وہ نقل رکھ کر آپ کو بھیج دینگے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اُنھوں نے خطوط کی نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا اور میں نے یہ طریقہ منظور کرلیا تھا۔ لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح کھویا گیا کہ اجمل خاں صاحب کو خط دینا بھول گیا۔ ۹۔ اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کرکے احمد نگر لے جا رہے تھے، تو بعض کاغذات رکھنے کے لیے راہ میں اٹاچی کیس کھولا، اور یکایک وہ خط سامنے آگیا۔ اب دنیا سے تمام علاقے منقطع ہو چکے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اُسے اٹاچی کیس سے نکال کر مسودات کی فائل میں رکھ دیا اور فائل کو صندوق میں بند کردیا۔

ڈھائی بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محبوس تھے اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی، اور اُس دنیا میں جو قیدخانے کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہوگئی:

کیف الوصول الی سعاد، و دونھا

قلل الجبال و بینھن حتوف

دوسرے دن یعنے ۱۰۔ اگست کو حسب معمول صبح تین بجے اُٹھا۔ چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے، وہاں بھی سامان کے ساتھ آگیا تھا۔ میں نے چائے دم دی۔ فنجان سامنے رکھا، اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات

مختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے۔ اچانک وہ خط جو ۳۔ اگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا۔ یاد آگیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کر دوں، اور آپ سُن رہے ہوں یا نہ سُن رہے ہوں، مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف رہے۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہوگیا، اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوبات قلمبند ہوتے رہے۔ آگے چل کر بعض دیگر احباب واعزہ کی یاد بھی سامنے آئی، اور اُن کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ طبعِ واماندۂ حال دراز نفسی کرتی رہی۔ قیدخانہ سے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے، اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکینگے یا نہیں۔ تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دلِ مستمند پر چھاگئی تھیں کہ قلم اُٹھالیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا کبھی بالِ کبوتر سے۔ میرے حصے میں عنقا آیا:

ایں رسم وراہِ تازہ زحرمانِ عہدِ ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود!

۱۰۔ اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس کے بعد رُک گیا۔ کیونکہ ۹۔ اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ کے بعد طبعِ درماندۂ حال بھی رُک گئی تھی، اور اپنی واماندگیوں میں گم تھی۔ اگرچہ اس کے

بعد بھی بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا اور قلعۂ احمد نگر کی اسیری کے تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہیں، تاہم یہ حقیقتِ حال چھپانی نہیں چاہتا کہ قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی، جسم و صورت کی تھی۔ قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا تھا مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا:

دلِ دیوانۂ دارم کہ در صحراست پنداری

اس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں، مگر اب سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی جس نے اوائل حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا۔ اب صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا۔ اور کسی تحریر و تسوید کے لیے طبیعت مستعد نہ ہوئی، آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلمبند ہوا ہے، ۳۔ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ اس مکتوب پر یہ داستانِ بے ستون و کوہکن ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ زندگی کی داستان ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے:

شمہ از داستانِ عشقِ شور انگیز ماست

ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند!

غور کیجیے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے

تین برس کی مدت ہو یا تین دن کی، مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچیے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیونکر کٹیگی؟ گزرنے کے بعد سوچیے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا، وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا:

رہائی کے بعد جب کانگریس ورکنگ کمیٹی کی شرکت کے لیے ۲۱ رجون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اُسی مکان اور اُسی کمرہ میں ٹھہرا جہاں تین برس پہلے اگست ۴۲ء میں ٹھہرا تھا، تو یقین کیجیے، ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے ۹۔ اگست اور اُس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے، اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گزر چکا، وہ خواب تھا، یا جو کچھ گزر رہا ہے یہ خواب ہے:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

۱۵۔ جون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیے۔ خیال تھا کہ اُنہیں حسبِ معمول نقل کرنے کے لیے دے دونگا، اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دونگا۔ لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو اُن کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مُصر ہوئے کہ انہیں بلا تاخیر اشاعت کے لیے دے دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک خوش نویس کو شملہ میں بُلا یا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے،

اور اُمید ہے کہ عنقریب طباعت کے لیے پریس کے حوالہ کر دیا جائیگا۔ اب میں اُن مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجونگا۔ مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کرونگا۔

شملہ میں اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے۔ اُنھوں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے اس سلسلے کے پہلے مکتوب کی نقل لے لی تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہوگیا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گذرا ہو" صدیق مکرّم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا:

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود!

مکتوبات کے دو حصّے کر دیے ہیں۔ غیر سیاسی اور سیاسی۔ یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثنا آپ کے نام لکھے گئے ہیں۔

پرسوں دہلی کا قصد ہے۔ چونکہ امریکن فوج کے کمانڈر مقیم دہلی نے ازراہِ عنایت اپنے خاص ہوائی جہاز کے یہاں بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے، اس لیے موٹر کے تکلیف دہ سفر سے بچ جاؤنگا اور ڈھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤنگا۔ وہاں عید کی نماز پڑھ کر بمبئی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ۱۰ سے ۲۴ تک بمبئی میں قیام رہیگا۔ جواب وہیں مرحمت ہو۔

ابوالکلام

۳۔ اگست سنہ ۴۲ءکا مکتوب سفر

جو ۹۔ اگست کی گرفتاری کی وجہ سے بھیجا نہ جا سکا اور جس کی طرف احمد نگر
کے پہلے مکتوب میں اشارہ کیا گیا ہے۔

بمبئی میل (براہ ناگپور)

۳۔ اگست سنہ ۴۲ء

صدیق مکرم — دہلی اور لاہور میں انفلوئنزا کی شدت نے بہت خستہ کر دیا تھا۔ ابھی تک اُس کا اثر باقی ہے۔ سر کی گرانی کسی طرح کم ہونے پر نہیں آتی۔ حیران ہوں، اس وبالِ دوش سے کیونکر سبکدوش ہوں؟ دیکھیے "وبالِ دوش" کی ترکیب نے غالب کی یاد تازہ کر دی:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

۲۹۔ جولائی کو اس وبال کے ساتھ کلکتہ واپس ہوا تھا۔ چار دن بھی نہیں گزرے کہ کل ۲۔ اگست کو بمبئی کے لیے نکلنا پڑا۔ جو وبال ساتھ لایا تھا اب پھر اپنے ساتھ واپس لے جا رہا ہوں:

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں!

مگر دیکھیے، صبح چار بجے کے وقتِ گرانمایہ کی کرشمہ سازیوں کا بھی کیا حال ہے؟ قیام کی حالت ہو یا سفر کی، ناخوشی کی کلفتیں ہوں یا دل آشوبی کی کاہشیں، جسم کی ناتوانیاں ہوں یا دل و دماغ کی افسردگیاں، کوئی حالت ہو، لیکن اس وقت کی مسیحائیاں اُفتادگانِ بسترِ الم سے کبھی تغافل نہیں کر سکتیں:

فیضے عجبے یافتم از صبح ببینید
ایں جادۂ روشن رہِ میخانہ نہ باشد

میں ایک کوپے میں سفر کر رہا ہوں۔ اس میں چار کھڑکیاں ہیں۔ دو بند تھیں۔ دو کھلی تھیں۔ میں نے صبح اُٹھتے ہی دو بند بھی کھول دیں۔ اب ریل کی رفتار جتنی گرم ہوتی جاتی ہے، اُتنی ہی ہوا کے جھوکوں کی خُنکی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ جس بسترِ کرب پر ناخوشی[1] کی کلفتوں نے گرایا تھا، اُسی پر نسیمِ صبح گاہی کی چارہ فرمائیوں نے اب اُٹھا کر بٹھا دیا ہے۔ شاید کسی ایسی ہی رات کی صبح ہوگی، جب خواجۂ شیراز کی زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا:

خوشش باد انسیمِ صبح گاہی
کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد!

ٹرین آج کل کے معمول کے مطابق بے وقت جارہی ہے۔ جس منزل سے اس

---

[1] یہاں "ناخوشی" سے محض خوشی کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ فارسی کا "ناخوشی" مقصود ہے۔ فارسی میں بیماری کو ناخوشی کہتے ہیں۔

وقت تک گزر جاتا تھا، ابھی تک اُس کا کوئی سُراغ دکھائی نہیں دیتا۔ سوچتا ہوں تو اس معاملۂ خاص میں وقت بھی معاملۂ عام کی پوری تصویر نمایاں ہو جاتی ہے:

کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگزشت و دگرے درپیش ست

رات ایک ایسی حالت میں کٹی جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں، نہ سکون سے۔ آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا، کُھل جاتی تھی تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہو گئی۔ ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا۔ دوسرا تخریب کی برہم زنی:

بیدار یے میانِ دو خواب ست زندگی
گر دِ تخیّل دو سراب ست زندگی!

از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است
یعنے طلسم نقش بر آب ست زندگی!

تین بج کر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کُھل گئی۔ صبح کی چائے کے لیے سفر میں یہ معمول رہتا ہے کہ رات کو عبد اللہ اسپرٹ کا چولھا اور پانی کی کیتلی، پانی بمقدار مطلوب بھری ہوئی، ٹیبل پر رکھ دیتا ہے۔ چائدانی اس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بحکم وضع الشئ فی محلہ یہی اُس کا محلِ صحیح ہونا چاہیے۔ مگر فنجان اور شکر دانی کے لیے اس کا قرب ضروری نہ ہوا کہ وضع الشئ فی غیر محلہ میں داخل ہو جاتا۔ اگر صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر کوئی اسٹیشن آجاتا ہے تو اکثر حالتوں میں عبد اللہ

اگر چائے دم دے دیتا ہے۔ نہیں آیا تو پھر خود مجھے ہی اپنے دستِ شوق کی کامجویانہ سرگرمیاں کام میں لانی پڑتی ہیں" ۔ "اکثر حالتوں" کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ تمام کلیّوں کی طرح یہ کلیّہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن پر رک بھی جاتی ہے مگر عبداللہ کی صورت نظر نہیں آتی پھر جب نظر آتی ہے تو اس کی معذرتیں میری فکر کاوش آشنا کے لیے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صبح گاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لیے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے۔ اُس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے، عبداللہ کو اور زیادہ سُلا دیتی ہے۔ الارم کی ٹائم پیس بھی اس کے سرہانے رہنے لگی، پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا۔ معلوم نہیں، آپ اس اشکال کا حل کیا تجویز کریں گے، مگر مجھے شیخ شیراز کا بتلایا ہوا حل مل گیا ہے اور اس پر مطمئن ہو چکا ہوں:

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست

در باغ لالہ روید و در شور بوم خس!

بہر حال چائے کا سامان حسبِ معمول مرتب اور آمادہ تھا۔ نہیں معلوم، آج اسٹیشن کب آئے؟ اور آئے بھی تو اس کا اطمینان کیونکر ہو کہ عبداللہ کی آمد کا قاعدۂ کلیّہ آج ہی بہ حالتِ استثنا نمودار نہ ہوگا؟ میں نے دیا سلائی اٹھائی اور چولھا روشن کر دیا۔ اب چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔

مقصود اس تمام درازنفسی سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطبت کے لیے تقریبِ سخن ہاتھ آئے:

نفسے بیادِ تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم

چائے بہت لطیف ہے۔ چین کی بہترین قسموں میں سے ہے۔ رنگ اس قدر ہلکا کہ واہمہ پر اس کی ہستی مشتبہ ہو جائے۔ گویا ابونواس والی بات ہوئی:

رقّ الزجاج و رقّت الخمر

فتشابھا، فتشا کل الامر!

کیف اس قدر تند کہ بلا مبالغہ اس کا ہر فنجان قاآنی کے رطلِ گراں کی یاد تازہ کر دے:

ساقی بدہ رطلِ گراں، کاں می کہ دہقاں پرورد

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگرٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں۔ پھر اس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لونگا اور متصلاً سگرٹ کا بھی ایک کش لیتا رہونگا۔ علمی اصطلاح میں اس صورتِ حال کو علیٰ سبیل التوالی والتعاقب کہیے۔ اس

طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگرٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بہ تدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدار کے حسنِ تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان آخری جرعہ سے خالی ہوا، اُدھر تمباکوئے آتش زدہ نے سگرٹ کے آخری خطِ کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں، ان دو اجزاءِ تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیسا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہوگیا۔ جی چاہتا ہے، فیضی کے الفاظ مستعار لوں:

اعتدالِ معانی از من پرس
کہ مزاجِ سخن شناختہ ام

آپ کہیں گے، چائے کی عادت بجائے خود ایک علّت تھی۔ اس پر مزید علّت ہائے نافرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے؟ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا، علتوں پر علتیں بڑھانا، اور گویا حکایت بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کرونگا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں۔ لیکن کیا کہوں۔ جب کبھی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا، طبیعت اس پر مطمئن نہ ہوسکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگارِ خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں:

پیرِ ما گفت خطا در قلمِ صنع نہ رفت
آفریں بر نظرِ پاکِ خطا پوشش باد!

غور کیجیے وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے؟ وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم رہتی ہو؟

تو و قطعِ منازلہا، من و یک لغزشِ پائے!

اور پھر اگر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیے تو سارا معاملہ بالآخر وہیں جا کر ختم ہو جائیگا، جہاں کبھی عارفِ شیراز نے اُسے دیکھا تھا:

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہدِ ہمچو توئی یا بفسقِ ہمچو منی!

اور اگر پوچھیے کہ پھر کامرانیِ عمل کا معیار کیا ہوا اگر یہ آلودگیاں راہ میں مخل نہ سمجھی گئیں؟ تو اس کا جواب وہی ہے جو عرفاءِ طریق نے ہمیشہ دیا ہے:

ترک ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش!

یعنے ترک و اختیار، دونوں کا نقشِ عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھائیے کہ آلودگیاں دامن تر کریں مگر دامن پکڑ نہ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے اُلجھنا مخل نہیں ہوتا، دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے۔ لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے

کہ جب چاہا، اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی:

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے۔ نہ تو تردامنی کی گرانی محسوس کیجیے، نہ خشک دامنی کی سبک سری۔ نہ آلودہ دامنی پر پریشاں حالی ہو، نہ پاک دامنی پر سرگرانی:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است!

آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ شاید رشتۂ سخن کی ایک گرہ اس سے کھل جائے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا، تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانہ میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سگرٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیرِ اثر پہلے ہاتھ بڑھا کہ اسے جیب میں رکھ لوں، پھر صورتِ حال کا احساس ہوا تو رک گیا۔ لیکن پولیس کمشنر نے جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا، بااصرار کہا کہ ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا۔ اس میں دس سگرٹ تھے۔ ایک کمشنر پولس کے آفس میں پیا۔ دوسرا راستہ میں سلگایا۔ دو ساتھیوں کو پیش کیے۔ چھ باقی رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر

سے جب اندر جانے لگا تو خیال ہوا، اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سگرٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا، اور پھر اُس دن سے لے کر دو برس تک سگرٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس سگرٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے اور قید خانہ کا احتساب عمداً چشم پوشی کرتا تھا۔ بعض شُربِ الیہود کا طریقہ کام میں لاتے تھے:

شُربِ الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم!

بعضوں کی جراتِ رندانہ اس قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ:

ولا تسقنی سرًّا، فقد امکن الجھر!

پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنے توبۂ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہوا۔ کئی مرتبہ گھر سے سگرٹ کے ڈبے آئے اور میں نے دوسروں کے حوالے کر دیے:

خوشم کہ توبۂ من نرخِ بادہ ارزاں کرد!

سرگزشت کا اصلی واقعہ اب سُنیے۔ جس دن علی الصباح مجھے رہا کیا گیا تو قید خانہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگرٹ کیس نکالا اور از راہ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجیے۔ جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو[۲] سال پہلے سگرٹ ترک کیا تھا، اُتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول بھی کر لی۔ ۔ ۔

ترک میں دیر لگی تھی، نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ نہ محرومی پر ماتم ہوا تھا، نہ حصول پر نشاط ہوا۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزہ دیا تھا، وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا:

حریفِ صافیے و دُردی نہ، خطا ایں جاست
تمیزِ ناخوش و خوش می کُنی، بلا ایں جاست!

۱۹۲۱ء کے بعد پھر تین مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا۔ لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کیونکہ سگرٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے۔ وہ دیکھے گئے مگر روکے نہیں گئے۔ اگر روکے جاتے تو پھر ترک کر دیتا۔

اب قلم کی سیاہی جواب دینے لگی ہے اس لیے رک جاتا ہوں:

قلم ایں جا رسید و سر بشکست

ابوالکلام

داستانِ بے ستون و کوہکن

قلعۂ احمد نگر
۱۰۔ اگست سنہ ۱۹۴۲ء

از ساز و برگِ قافلۂ بے خوداں مپرس
بے نالہ می رود جرسِ کاروانِ ما!

صدیقِ مکرم! کل صبح تک وسعت آبادِ بمبئی میں فرصتِ تنگ حوصلہ کی بے مائگی کا یہ حال تھا کہ ۳۔ اگست کا لکھا ہوا مکتوب سفر بھی اجمل خاں صاحب کے حوالہ نہ کر سکا کہ آپ کو بھیج دیں۔ لیکن آج قلعۂ احمد نگر کے حصارِ تنگ میں اُس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھیے کہ جی چاہتا ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کر دوں:

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش
لشکرِ آہِ من از دل خیمہ بیروں می زند

نو مہینے ہوئے، ۴۔ ڈسمبر سنہ ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانہ کا دروازہ میرے لیے کھولا گیا تھا۔ کل ۹۔ اگست سنہ ۴۲ء کو سوا دو بجے قلعۂ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی

دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں، اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تاکہ کھلیں
نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم ہوتی:

دو کروٹیں ہیں عالمِ غفلت میں خواب کی!

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گزر چکی:

چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے، معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کریگا:

فریبِ جہاں قصۂ روشن ست
ببیں تا چہ زاید، شب آبستن ست

۴۔ اگست کو بمبئے پہنچا تو انفلوئنزا کی حرارت اور سر کی گرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا۔ تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیف ہو لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ ۴ سے ۷۔ اگست تک ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے۔ ۷۔ کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا، لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ ۸ کو دو بجے سے رات کے گیارہ بجے تک بیٹھنا پڑا لیکن کارروائی ختم کر کے اٹھا:

کام تھے عشق میں بہت، پر میر

ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا تو صاحبِ مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب کچھ عرصہ سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں اُن سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچا جاتا تھا تاکہ اُن کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اگرچہ میں نے ابھی تک ان کا استعفا منظور نہیں کیا ہے، لیکن انہیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لیے کہا بھی نہیں۔ وہ کہنے لگے۔ فلاں شخص شام کو آیا تھا، کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئیگا" دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دہلی سے کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ میں سنتے سنتے تھک گیا تھا:

یا وفا، یا خبرِ وصلِ تو یا مرگِ رقیب،

بازیِ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ ان کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں میں نے جھنجھلا کر کہا جس طرح کے حالات در پیش

ہیں، ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اُڑا ہی کرتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اعتبار کیا؟ اور پھر اگر واقعی ایسا ہی ہونے والا ہے تو ان باتوں میں وقت خراب کیوں کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجیے کہ آدھی رات جواب باقی رہ گئی ہے، ہاتھ سے نہ جائے، اور چند گھنٹے آرام کرلوں:

گر غم خوریم خوش نہ بود، بہ کہ مے خوریم!

حسبِ معمول چار بجے اُٹھا، لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن اسپرین (Genasprin) کی دو گولیاں مُنہ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اُٹھایا کہ بعض ضروری خطوں کا مسودہ لکھ لوں جو رات کی تجویز کے ساتھ پریسیڈنٹ روز ویلٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا، اور اس کے ختم ہوتے ہی رات بھر کی اُمس بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اور ہوا کے ٹھنڈے اور نم آلود جھونکے بھیجنے لگی تھیں۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہوگا، کچھ نسیم صبحگاہی کے ان شفابخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے سر کی گرانی کم ہو رہی ہے۔ پھر افاقہ کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کردی:

نسیمِ صبح! تیری مہربانی!

بے اختیار ہو کر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا محسوس ہوا، جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ

کئی کاریں مکان کے احاطہ میں داخل ہوگئی ہیں اور اُس بنگلے کی طرف جارہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے میں واقع ہے، اور جس میں صاحبِ مکان کا لڑکا دھیرو رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا، میں خواب دیکھ رہا ہوں، اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا:۔

زہے مراتب خوابے کہ بہ زبیداری ست!

شاید اس حالت پر دس بارہ منٹ گزرے ہونگے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کُھلی تو کیا دیکھتا ہوں۔ دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے، "دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر میرے لیے کافی تھی مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں:

کِس کِس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی؟

میں نے دھیرو سے کہا، مجھے ڈیڑھ گھنٹہ طیاری میں لگیگا۔ اِن سے کہہ دو کہ انتظار کریں۔ پھر غسل کیا، کپڑے پہنے، چند ضروری خطوط لکھے، اور باہر نکلا تو پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے:

کار مشکل بود، ما برخویش آساں کردہ ایم!

کار باہر نکلی تو صبح مُسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے۔ یہ پھولوں کی خوشبو چُن چُن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں

سے فضا میں پھیلاتا رہے۔ ایک جھونکا کار میں سے ہو کر گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آگئی:

صبا وقتِ سحر بوئے ز زلفِ یار می آورد

دلِ شوریدۂ ما را ز نو در کار می آورد!

کار وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر پہنچی، تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرہ کے حصار میں تھا، اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گزر رہا تھا، لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہلچل دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ ایک انجن رسٹورنٹ کار کو دھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا، یہی کاروانِ خاص ہے جو ہم زندانیوں کے لیے طیار کیا گیا ہے۔ گاڑیاں کوریڈور کیریج (Corridor carriage) قسم کی لگائی گئی تھیں، جو آپس میں جڑ جاتی ہیں اور آدمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندر ہی اندر چلا جا سکتا ہے۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا، گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آچکے ہیں جو نہیں آئے وہ آتے جاتے ہیں:

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں!

بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے، ان کے چہروں پر بے خوابی اور ناوقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا، رات دو بجے سویا اور چار بجے

اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا، بہ مشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہوگا۔ میں نے کہا، معلوم نہیں، سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے؟ اُسے بھی کوئی جگانے کے لیے پہنچا یا نہیں؟

درازیِ شب و بیداریِ من ایں ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست!

بہر حال وقت کی گرمجوشیوں میں یہ شکایتیں مخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چونکہ رسٹورنٹ کار لگ چکی تھی اور چائے کے لیے پوچھ گیا تھا، اس لیے گو پی چکا لیکن پھر منگوائی، اور ان نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جامِ صبح گاہی سے بادۂ دوشینہ کا خمار اُتارئیں:

بنوش مے چو سبک روحی اے حریف مدام
علی الخصوص دریں دم کہ سر گراں داری!

یہاں "بادۂ دوشینہ" کی ترکیب محض "جامِ صبح گاہی" کی مناسبت سے زبانِ قلم پر طاری ہو گئی۔ مگر غور کیجیے، کتنی مطابقِ حال واقع ہوئی ہے؟ صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورتِ حال کیسی منقلب ہو گئی؟ کل شام کو جو بزمِ کیف و سرور آراستہ ہوئی تھی، اُس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دو پہر رات تک طول کھینچا تھا، لیکن اب صبح کے وقت دیکھیے تو:

نے وہ سرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے!

رات کی تر دماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی، اور مجلس دوشیں کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی، تو اب صبحِ خمار کی افسردہ جماہیوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا تھا:

خمیازہ سنجِ تہمتِ عیشِ رمیدہ ایم
مے آں قدر نہ بود کہ رنجِ خمار بُرد!

رات کی کیفیتیں جتنی تند و تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اُتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی سیہ مستیوں کے بعد اب صبحِ خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا، تو ایسا ہونا ناگزیر تھا، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا، تو کاش، جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی، اور نپے تُلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیے ہوتے۔ خواجہ میر درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رندِ شرابی کا
بھڑا دے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا!

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سیکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سُنا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لُطف اُسی وقت آیا:

کس نہ دانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید!

بمبئے میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں، اُن میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خاں پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جا رہا تھا۔ جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی، اور پونا کی راہ اختیار کی تو سب کو خیال ہوا غالباً منزلِ مقصود پونا ہی ہے۔ لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقا اُتار لیے گئے۔ اور بمبئے کے مقامی قافلہ کو بھی اُترنے کے لیے کہا گیا، مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا، اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا:

جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

اب احمد نگر ہر شخص کی زبان پر تھا۔ کیونکہ اگر پونا میں ہم نہیں اُتارے گئے تو پھر اس رُخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں تبلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستر اسّی میل سے زیادہ نہیں، اس لیے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہیے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جا رہا تھا۔ احمد نگر یقیناً دور نہیں ہے۔ بہت جلد آجائیگا، مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے؟ احمد نگر سے تو شروع ہوگا۔ بے اختیار ابو العلاء معرّی کا لامیہ یاد آگیا:

فیا دارھا بالخیف، انّ مزارھا

قریبٌ، ولٰکن دون ذٰلک اھوال

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے
مگر قلعۂ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئے میں تھا تو قصد بھی
کیا تھا مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے اُن خاص مقامات
میں سے ہے جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں
وابستہ ہوگئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اِسی نام کا گاؤں
آباد تھا۔ پندرہویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور
پڑ گئی تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے علم استقلال بلند کیا، اور بھینگر کے قریب
احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اُسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اُس وقت سے نظام
شاہی مملکت کا دار الحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ، جس کا خاندان مازندران
سے آکر یہیں آباد ہوا تھا، لکھتا ہے، چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و
وسعت پیدا کرلی تھی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا:

کس پائمال آفت فسودگی مباد

دیروز ریگ بادیہ آئینہ خانہ بود!

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا اُس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے
برہان نظام شاہ اوّل نے اسے منہدم کرکے ازسرِنو پتھر کا حصار تعمیر کیا، اور
اُسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ
پہنچا۔ ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ولیسلی نے (جو آگے چل کر

ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا، تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا، پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جاسکتی ہے:

کارواں رفتہ و اندازۂ جاہش پیداست
زاں نشانہا کہ بہ سر راہگزار افتادست!

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگارِ زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں، اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اُتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کرلیا ہے:

بیفشاں جرعۂ بر خاک و حالِ اہلِ شوکت بیں!
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد!

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگذشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سُہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا، تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا "چنیں انبوہے در پیش و فتح آسمانی۔ اگر حادثہ رو دہد جائے نشاں دہید کہ شمارا دریابیم" خانخاناں نے جواب دیا تھا "زیر لاشہا!"

ونحن اناس لا توسط بیننا

لنا الصدر دون العالمین او القبر!

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کر دیے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے۔ ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا، اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گزر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھے سو برس کی داستانِ کہن لیے ورق پر ورق الٹتا جاتا۔ ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا:

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مجھے خیال ہوا، اگر ہمارے قید و بند کے لیے یہی جگہ چُنی گئی ہے تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں۔ ہم خرا باتیوں کے لیے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا:

بایک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائیست!

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے۔ انہی میں مقامی چھاونی کا کمانڈنگ افیسر بھی تھا، جس سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے

لگاکہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اُٹھا دیا تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں، لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے:

ہاں، رہ عشق ست، کج گشتن نہ دارد باز گشت

جرم را ایں جا عقوبت ہست، استغفار نیست!

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہوگی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلہ پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ اب اُس دنیا میں جو قلعہ سے باہر ہے، اور اُس میں جو قلعہ کے اندر ہے، صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعہ کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے، خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ

دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا!

قلعہ کی خندق، جس کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی، اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ویلیسلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا، مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے، اس طرف پاٹ دی گئی ہے۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا

کہ قلعہ کی دیوار چھُپ گئی تھی، وہ بھی اس رُخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔

قلعہ کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی۔ پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد ایک احاطہ کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہوگا اور اس لیے چڑھائی پر واقع ہے۔ کاریں رُک گئیں اور ہمیں اُترنے کے لیے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس بمبئے نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا، ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ افیسر کے حوالہ کی۔ وہ فہرست لے کر دروازہ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سر رشتہ حکومتِ بمبئے کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آگیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہوگئے:

در جستجوئے ما نہ کشی زحمتِ سُراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا۔ غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے، اور بیچ میں کھُلی جگہ ہے، یہ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جا سکے، تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لیے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرہ سے باہر نکلیگا تو محسوس کریگا کہ

کھلی جگہ میں آ گیا۔ کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اُڑائی جا سکتی ہے:

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے۔ جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے، مگر جھنڈا اُتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کے لیے سر اُٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا:

یہیں ملینگے تجھے نالۂ بلند ترے!

احاطہ کے شمالی کنارہ میں ایک پُرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے۔ نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دِیا جلا کرتا تھا:

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں!

معلوم نہیں یہ کس کی قبر ہے؟ چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہر حال کسی کی ہو، مگر کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہوگی ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرائی گئیں، وہاں اسے بھی گرا دیا ہوتا۔ سبحان اللہ! اس روزگار خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتی ہیں! اس پُرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لیے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی

کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو!

کشتوں کا تیری چشمِ سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی تو خرابات ہو ویگا!

مغربی رُخ کے تمام کمرے کھُلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر کہ بچھی ہوئی تھی دراز ہوگیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری:

ما گوشہ را نہ بہرِ قناعت گرفتہ ایم
تن پروری بہ گوشۂ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے سے چھے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو نو بجے تکیہ پر سر رکھا تو صبح تین بجے آنکھ کھولی:

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے!

تین بجے اُٹھا تو تازہ دم اور چست و چاق تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی۔ نہ انفلوئنزا کا نام و نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلۂ حرارت کام میں لایا، اور چائے بنائی۔ اب جام و صراحی سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصور کرتا ہوں اور یہ داستانِ بے ستون و کوہکن سُنا رہا ہوں:

شیریں تر از حکایتِ ما نیست قصۂ تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم!

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل صبح بمبئے سے چلتے ہوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا۔ تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا ہے:۔

"غلط گفتی" چرا سجادۂ تقویٰ گرد گردی؟
بہ زُہد آلودہ بودم، گرنمی کردم چہ می کردم!

یہ اُسی غزل کا شعر ہے جس کا ایک اور شعر جو مجتہدِ کاشان کی نسبت کہا تھا بہت مشہور ہو چکا ہے:۔

زِ شیخِ شہر جاں بردم بہ تزویرِ مسلمانی
مدارا گر بہ ایں کافر نمی کردم چہ می کردم!

ردیف کا نبھانا آسان نہ تھا مگر دیکھیے، کس طرح بول رہی ہے؟ بول نہیں رہی ہے، چیخ رہی ہے۔ میں بھی اس وقت چائے کے فنجان پہ فنجان لنڈھائے جاتا ہوں اور اس کا مطلع دُہرا رہا ہوں:۔

زِ ساغر گر دماغے تر نمی کردم، چہ می کردم!

خدارا داد دیجیے۔ نظر بہ حالاتِ موجودہ یہاں "چہ میکردم" کیا قیامت ڈھا رہا ہے؟ گویا یہ مصرعہ خاص اسی موقع کے لیئے کہا گیا تھا۔ مگر یوں پتہ نہیں چلیگا۔ "چہ میکردم" پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر پڑھیے۔ پھر دیکھیے، صورتِ حال کی

پوری تصویر کس طرح سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، کلپترہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم، بحالت موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں؟ تاہم کیا کروں۔ افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوقِ خامہ فرسا کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا:-

گر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

ابو الکلام

قلعۂ احمد نگر

۱۱۔ اگست سنہ ۴۲ء

صدیقِ مکرم، قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ سنہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر سنہ ۲۱ء، سنہ ۳۱ء، سنہ ۳۲ء اور سنہ ۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی، اور اب پھر اسی منزل سے قافلۂ بادپیمائے عمر گزر رہا ہے:۔

بازمی خواہم ز سر گیرم رہِ بیہودہ را!

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے، تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عمر کے تریپن ۵۳ برس جو گزر چکے ہیں اُن سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزرا۔ تورات کے احکامِ عشرہ میں ایک حکم سبت کے لیئے بھی تھا۔ یعنے ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام

لے یہ مکتوب ۱۱۔ اگست سنہ ۴۲ء کو لکھا تھا۔ اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گزر گئے۔ اور مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی۔ اس اضافہ کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصہ کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی، اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔

نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی۔ سو ہمارے حصّہ میں بھی سبت کا دن آیا مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں۔ گویا خواجۂ شیراز کے دستور العمل پر کاربند رہے:۔

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن
سہ ماہ مے خور و نُہ ماہ پارسامی باش

وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مُرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود!

وقت کے جو حالات ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، اُن میں اس ملک کے باشندوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں، بے حسی کی زندگی بسر کریں یا احساس حال کی۔ پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے، مگر دوسری کے لیے قید خانہ کی کوٹھڑی کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دونوں راہیں کھُلی تھیں۔ پہلی ہم اختیار نہیں کر سکتے تھے، ناچار دُوسری اختیار کرنی پڑی:۔

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

زندگی میں جتنے جرم کیے اور اُن کی سزائیں پائیں، سوچتا ہوں تو اُن سے کہیں زیادہ تعداد اُن جرموں کی تھی جو نہ کرسکے اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں، لیکن ناکردہ جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں؟

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے!

سنہ ۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا، تو مجھے پہلی مرتبہ موقع مِلا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اُس وقت عمر کے صرف ستائیس ۲۷ برس گزرے تھے "الہلال" "البلاغ" کے نام سے جاری تھا۔ دارالارشاد قائم ہوچکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا، اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہونا پڑا، اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلابِ حال میں طبیعت کے لیے بڑی آزمائش ہونی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھ رہا[لہ]:

لہ۔ اپریل سنہ ۱۶ء میں حکومت بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا تھا۔ میں رانچی گیا اور شہر سے باہر مورآبادی میں مقیم ہو گیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد جب اس صورتِ حال کا ردِ عمل شروع ہوا، تو معلوم ہوا کہ معاملہ اتنا سہل نہ تھا جتنا ابتدائی حال کی سرگرمیوں میں محسوس ہوا تھا اور اس کی آزمائشیں ابھی گذر نہیں چکیں، بلکہ اب پیش آرہی ہیں۔

جب کبھی اس طرح کا معاملہ یکایک پیش آجاتا ہے تو ابتدا میں اس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں۔ کیونکہ طبیعت میں مقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ صورتِ حال سے دب جائے وہ اُس کا غالبانہ مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ ایک پُر جوش نشہ کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ نشہ کی تیزی میں کتنی ہی سخت چوٹ لگے اس کی تکلیف محسوس نہیں ہو گی۔ تکلیف اُس وقت محسوس ہوگی۔ جب نشہ اترنے لگے گا اور جمائیاں آنی شروع ہوں گی۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوگا، جیسے سارا جسم درد سے چُور چُور ہو رہا ہو۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی پہلا دور نشۂ جذبات کی خود فراموشیوں کا گزرا۔ علائق کا فوری انقطاع، کاروبار کی ناگہانی برہمی مشغولیتوں کا یک قلم تعطّل، کوئی بات بھی دامنِ دل کو کھینچ نہ سکی۔ کلکتہ سے بہ اطمینان تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک غیر آباد حصّہ میں مقیم ہو گیا لیکن پھر جوں جوں دن گزرتے گئے، طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں،

اور صورتِ حال کا ایک ایک کانٹا پہلو سے دل میں چبھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنی طبیعت کی اس انفعالی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا، اور ایک خاص طرح کا سانچا اُس کے لیے ڈھالنا پڑا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک، کہ چھبیس برس گزر چکے، وہی سانچا کام دے رہا ہے، اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی بھی برابر بڑھتی گئی لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی (Stoical) بے پروائی پیدا کر دیتا ہے، اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے، لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی تسکین ہوتی ہے ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ فقدان کا افسوس کم کر دے گا۔ لیکن حاصل کی کوئی اُمید نہیں دلائیگا۔ اگر ہماری راحتیں ہم سے چھین لی گئی ہیں، تو فلسفہ ہمیں کلیلہ دمنہ (پنچ تنتر) کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کرے گا "لا تأس علیٰ ما فات" جو کچھ کھو چکا، اُس پر افسوس نہ کر۔ لیکن کیا اِس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے؟ اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتلاتا، کیونکہ بتلا سکتا ہی

تھیں، اور اس لیے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لیے صرف اس کا سہارا کافی نہ ہُوا۔

سائنس عالمِ محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت (Physical Detem**i**nism) کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے عقیدہ کی تسکین اُس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ یقین اور اُمید کے سارے پچھلے چراغ گُل کر دے گا، مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا[1]۔ پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اُٹھائیں، تو کس کی طرف اُٹھائیں؟

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی میں
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند!

ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دُکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے:۔

دلِ شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

بلاشبہ مذہب کی وہ پُرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین

---

[1] سائنس اب "ثابت شدہ حقیقت" اور "طبیعاتی جبریت" کی متاع سے بھی تہی دست ہو چکا ہے اور جس "حقیقت" کے سُراغ میں نکلا تھا۔ وہی یک قلم اس پر مشتبہ ہو گئی ہے۔

ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی - اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بےرنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے، اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے۔ تو اسی سے مل سکتا ہے:-

در دیگرے بنما کہ من بکجا روم چو برانیم؟

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اُسے بند نہیں کر سکے گا - سائنس ثبوت دے دیگا مگر عقیدہ نہیں دے سکیگا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا - اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف اُنھی باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے جنھیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لیے مان لیتے ہیں - ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنھیں ثابت نہیں کر سکتے لیکن مان لینا پڑتا ہے:-

By faith, and faith alone, embrace

Believing, where we cannot prove

عام حالات میں مذہب انسان کو اُس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا۔ لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا - میری پیاس

اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پُرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈھنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہوگئی تھی، اور موروثی عقائد جس شکل وصورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے، اُن پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے، اور اُن کے متعارض دعوؤں اور متصادم فیصلوں نے حیران و سرگشتہ کر دیا۔ پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے، تو خود نفسِ مذہب کی عالمگیر نزاعیں سامنے آگئیں، اور اُنھوں نے حیرانگی کو شک تک، اور شک کو انکار تک پہنچا دیا۔ پھر اس کے بعد مذہب اور علم کی باہمی آویزشوں کا میدان نمودار ہؤا۔ اور اس نے رہا سہا اعتقاد بھی کھو دیا۔ زندگی کے وہ بنیادی سوال جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں، ایک ایک کرکے اُبھرے اور دل و دماغ پر چھا گئے۔ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے اور ایک ہی ہے۔ کیونکہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں، تو راستے مختلف کیوں ہوئے؟ کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ باہم متعارض اور متصادم ہوئے؟۔ پھر یہ کیا ہے کہ خلاف و نزاع کی ان تمام لڑتی ہوئی راہوں کے سامنے علم اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے، اور اُس کی بے رحم روشنی میں قدامت

اور روایت کی وہ تمام پُراسرار تاریکیاں جنہیں نوعِ انسانی عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہو گئی تھی، ایک ایک کر کے نابود ہو رہی ہیں!

یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے۔ اور انکار پر ختم ہوتی ہے، اور اگر قدم اُسی پر رُک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

مجھے بھی ان منزلوں سے گزرنا پڑا، مگر میں رُکا نہیں۔ میری پیاس مایوسی پر قانع ہونا نہیں چاہتی تھی۔ بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا، اُس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف و نزاع کی انہی متعارض راہوں، اور اوہام و خیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے جو یقین اور اعتقاد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے، اور اگر سکون و طمانیت کے سرچشمے کا سُراغ مِل سکتا ہے تو وہیں مِل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھو دیا تھا، وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مِل گیا۔ میری بیماری کی جو علّت تھی، وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی:

تداویتُ من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ
کما یتداوی شارب الخمر بالخمر!

البتہ جو عقیدہ کھویا تھا، وہ تقلیدی تھا، اور جو عقیدہ اب پایا، وہ تحقیقی تھا:-

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما!

جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں، ہم اس راہ کا سُراغ نہیں پا سکتے۔ لیکن جونہی یہ پٹیاں کُھلنے لگتی ہیں، صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دور تھی اور نہ کھوئی ہوئی تھی۔ یہ خود ہماری ہی چشم بندی تھی جس نے عین روشنی میں گُم کر دیا تھا:-

در دشتِ آرزو نہ بود بیمِ دام و دو
راہے ست ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو!

اب معلوم ہُوا کہ آج تک جسے مذہب سمجھتے آئے تھے، وہ مذہب کہاں تھا؟ وہ تو خود ہماری ہی وہم پرستیوں اور غلط اندیشیوں کی ایک صورتگری تھی:-

تا بغایت ما ہنر پنداشتیم
عاشقی ہم ننگ و عارے بودہ است!

ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں، مانتے رہیے۔ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہراہِ عام بن گئی ہے۔ سب اُسی پر چلتے ہیں۔ آپ بھی چلتے رہیے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں اسلام درج کرا دیجیے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچا ڈھل گیا ہے، اُسے نہ چھیڑیے اور اسی میں ڈھلتے رہیے لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریف و امتیاز کے لیے اُسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے، اور اسی کی راہ گم ہو جاتی ہے:-

ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا ایں جاست!

اسی مقام میں پہنچ کر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے، فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے، مدعیانِ علم کی خامکاریوں، اور مدعیان مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے، مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر:-

عبارا تنا شتّیٰ وحسنک واحد

وکلٌّ الیٰ ذاک الجمال یشیر!

علم عالمِ محسوسات سے سروکار رکھتا ہے۔ مذہب ماوراءِ محسوسات کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں دائروں کا تعدّد ہوا، مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماوراء ہے، ہم اسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں، اور یہیں سے ہمارے دیدۂ کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں:۔

برچہرہ حقیقت اگر ماند پردۂ   جرمِ نگاہِ دیدۂ صورت پرست ما!

بہر حال زندگی کی ناگواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی، بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار (Moral Values) کا یقین دلاتا ہے، اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیے۔ ایک بوجھ ہے جسے اُٹھانا چاہیے:۔

جلوۂ کاروانِ ما نیست بہ نالۂ جرس
عشق تو راہ می برد، شوقِ تو زاد می دہد

لیکن کیا یہ بوجھ کانٹوں پر چلے بغیر نہیں اُٹھایا جا سکتا؟

نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں خود زندگی کے تقاضے ہوئے جن کا ہمیں جواب دینا ہے، اور خود زندگی کے مقاصد ہوئے جن کے پیچھے والہانہ دوڑنا ہے جن باتوں کو ہم زندگی کی راحتوں اور لذتوں سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ہمارے لیے راحتیں اور لذتیں ہی کب رہیں گی اگر ان تقاضوں اور مقصدوں سے مُنہ موڑ لیں؟

بلاشبہ یہاں زندگی کا بوجھ اُٹھا کے کانٹوں کے فرش پر دوڑنا پڑا، لیکن اس لیے دوڑنا پڑا کہ دیبا و مخمل کے فرش پر چل کر ان تقاضوں کا جواب دیا نہیں جا سکتا تھا۔ کانٹے کبھی دامن سے اُلجھیں گے، کبھی تلوؤں میں چبھینگے لیکن مقصد کی خلش جو پہلوئے دل میں چبھتی رہیگی، نہ دامنِ تار تار کی خبر لینے دیگی، نہ زخمی تلوؤں کی:-

معشوق درمیانہ جاں مدعی کجاست

گل دردماغ می دمد، آسیب خار چیست؟

اور پھر زندگی کی جن حالتوں کو ہم راحت والم سے تعبیر کرتے ہیں، اِن کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہوئی کہ اضافت کے کرشموں کی ایک صورتگری ہے؟ یہاں نہ مطلق راحت ہے، نہ مطلق الم۔ ہمارے تمام احساسات سرتاسر اضافی ہیں:-

دویدن، رفتن، اِستادن، نشستن، خفتن و مردن!

اضافتیں بدلتے جاؤ۔ راحت والم کی نوعیتیں بھی بدلتی جائیں گی۔ یہاں ایک ہی ترازو لے کر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس نہیں تولا جا سکتا۔ ایک دہقان کی راحت والم تولنے کے لیے جس ترازو سے ہم کام لیتے ہیں، اُس سے فنونِ لطیفہ کے ایک ماہر کا معیار راحت والم نہیں تول سکیں گے۔ ایک ریاضی داں کو ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے میں جو لذّت ملتی ہے، وہ ایک ہوس پرست کو شبستانِ عشرت کی سیہ مستیوں میں کب مل سکے گی؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم پھولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے

کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں اور اس کی ہر چبھن میں راحت و سرور کا ایک نیا پیام پانے لگتے ہیں:۔

بہر یک گل، زحمتِ صد خار می باید کشید!

راحت والم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دے دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے، کبھی مرہم بن جاتا ہے بطلب و سعی کی زندگی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذت ہے، بشرطیکہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو:۔

رہرواں راخستگیِ راہ نیست
عشق ہم راہ ست وہم خود منزل ست!

اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، فلسفہ نہیں ہے۔ زندگی کے عام واردات ہیں۔ عشق و محبت کے واردات کا میں حوالہ نہیں دوں گا، کیونکہ وہ ہر شخص کے حصّے میں نہیں آسکتے۔ لیکن رندی اور ہوسناکی کے کوچوں کی خبر رکھنے والے تو بہت نکلینگے۔ وہ خود اپنے دل سے پوچھ دیکھیں کہ کسی کی راہ میں رنج والم کی تلخیوں نے کبھی خوشگواریوں کے مزے بھی دیئے تھے یا نہیں؟

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نہ ناصح
بدست آور رگِ جانے ونشتر را تماشا کن!

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ،

کوئی بندھن ہونا چاہیے جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جا سکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے:

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد   سرمد بہ مئے و پیالہ ربطے دارد

کوئی زندگی کی جسمانی کاربراریوں ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ کر اُن پر قانع ہو جاتا ہے۔ کوئی اُن پر قانع نہیں ہو سکتا۔ جو قانع نہیں ہو سکتے، اُن کی حالتیں بھی مختلف ہوئیں۔ اکثروں کی پیاس ایسے مقصدوں سے سیراب ہو جاتی ہے جو انہیں مشغول رکھ سکیں۔ لیکن کچھ طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لیے صرف مشغولیت کافی نہیں ہو سکتی۔ وہ زندگی کا اضطراب بھی چاہتی ہیں:

نہ داغِ تازہ می کارد، نہ زخمِ کہنہ می خارد،
بدہ یارب دلے، کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم

پہلوں کے لیے جو دل بستگی اس میں ہوئی کہ مشغول رہیں۔ دوسروں کے لیے اس میں ہوئی کہ مضطرب رہیں:

دریں چمن کہ ہوا داغِ شبنم آرائی ست
تسلّیے بہ ہزار اضطراب می بافند!

ایک خنک اور نا آشنائے شورشِ مقصد سے ان کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ اُنہیں ایسا مقصد چاہیے جو اضطراب کے انگاروں سے دہک رہا ہو، جو ان کے اندر شورش و سرمستی کا ایک تہلکہ مچا دے، جس کے دامنِ ناز کو پکڑنے کے لیے وہ

ہمیشہ اپنا گریبانِ وحشت چاک کرتے رہیں:

دامن اُس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دور نہیں!

ایک ایسا بلائے جاں مقصد، جس کے پیچھے اُنہیں دیوانہ وار دوڑنا پڑے۔ جو دوڑنے والوں کو ہمیشہ نزدیک بھی دکھائی دے، اور ہمیشہ دور بھی ہوتا رہے۔ نزدیک اتنا کہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیں۔ دور اتنا کہ اس کی گرد راہ کا بھی سُراغ نہ پا سکیں:

بامن آویزشِ او الفتِ موج ست و کنار
دمبدم بامن، و ہر لحظہ گریزاں از من!

پھر نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیے تو معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے صرف ترس نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ یکسانی، اگرچہ سکون و راحت کی ہو، یکسانی ہوئی، اور یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے نمکی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہو، مگر پھر تبدیلی ہے، اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں "حمّضوا مجالسکم" اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو۔ سو یہاں زندگی کا مزہ بھی اُنہی کو مل سکتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اُس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں، اور اس طرح زندگی کا ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ زندگی ہی کیا، جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر ہوتی رہے؟ خواجہ درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بتنگ
آخر جیئیگا کب تلک اے خضر؟ مر کہیں!

یہاں پانے کا مزہ اُنہی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنہوں نے کچھ کھویا ہی نہیں، اُنہیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟۔ نظیری کی نظر اسی حقیقت کی طرف گئی تھی،

آنکہ او در کلبۂ احزاں پسر گم کردہ، یافت
تو کہ چیزے گم نہ کردی، از کجا پیدا شود!

اور پھر اگر غور و فکر کا ایک قدم اَور آگے بڑھائیے، تو خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت و اضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اَور کیا ہے؟ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں، اگر چاہیں تو اُسی کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے، زندہ ہے۔ آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔ فارسی کے ایک شاعر نے دو مصرعوں کے اندر سارا فلسفۂ حیات ختم کر دیا تھا:

موجیم کہ آسودگیِ ما عدمِ ماست
ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم!

اور پھر یہ راہ اس طرح بھی طے نہیں کی جا سکتی کہ اُس کے اٹکاؤ کے ساتھ دوسرے لگاؤ بھی لگائے رکھیے۔ راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور

واقع ہوئی ہے۔ وہ رہرو کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھیے، میں نے یہ تعبیر غالبؔ سے مستعار لی:

خاکِ کویش خود پسند افتاد در جذبِ سجود
سجدہ از بہرِ حرم نگزاشت در سیمائے من!

مقصود اس تمام درازنفسی سے یہ تھا کہ آج اپنے اوراقِ فکر پریشاں کا ایک صفحہ آپ کے سامنے کھول دوں:

لختے زحالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم!

اس میکدۂ ہزار شیوہ و رنگ میں ہر گرفتارِ دامِ تخیل نے اپنی خود فراموشیوں کے لیے کوئی نہ کوئی جامِ سرشاری سامنے رکھ لیا ہے اور اسی میں بیخود رہتا ہے:

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خُم دہد، اما
در مجلسِ او مستی ہر یک زشرابے ست

کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے، کوئی کانٹوں سے، اور دونوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں کریگا کہ تہی دامن رہے۔ جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چُن رہے تھے، تو ہمارے حصے میں تمنّاؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ اُنہوں نے پھول چُن لیے اور کانٹے چھوڑ دیے۔ ہم نے کانٹے چُن لیے اور پھول چھوڑ دیے:

زخارزارِ محبت دلِ ترا چہ خبر   کہ گل بجیب نہ گنجد قبائے تنگ ترا!

قلعہ احمد نگر

۱۵۔ اگست ۴۲ء

مارا زبانِ شکوہ زبیدادِ چرخ نیست
از ما خطے بہ مہرِ خموشی گرفتہ اند

صدیق مکرم وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ صراحی لبریز ہے اور جام آمادہ۔ ایک دور ختم کر چکا ہوں۔ دوسرے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوں:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل ست
جریدہ رو کہ گزرگاہِ عافیت تنگ ست پیالہ گیر، کہ عمرِ عزیز بے بدل ست

طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکرِ این و آں سے بکلی آسودہ ہے۔ اپنی حالت دیکھتا ہوں تو وہ عالم دکھائی دیتا ہے جس کی خبر خواجۂ شیراز نے چھ سو سال پہلے دے دی تھی۔ زندگی کے چالیس سال طرح طرح کی کاوشوں میں بسر ہو گئے۔ مگر اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساری کاوشوں کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ صبح کا جانفزا وقت ہو، اور چین کی بہترین چائے کے پے درپے فنجان:

چل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت تدبیرِ ما بدستِ شرابِ دو سالہ بود!

آج تین بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی تھی۔ صحن میں نکلا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ صرف احاطہ کے باہر سے پہرہ دار کی گشت و بازگشت کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہاں رات کو احاطہ کے اندر وارڈروں کا تین تین گھنٹے کا پہرہ لگا کرتا ہے مگر بہت کم جاگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اُس وقت بھی سامنے کے برآمدے میں ایک وارڈر کمبل بچھائے لیٹا تھا اور زور زور سے خرّاٹے لے رہا تھا۔ بے اختیار مومن خان کا شعر یاد آگیا:

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لیے

زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریکِ حال ہو۔ سب بے خبر سو رہے ہیں، اور اسی وقت میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں:

دائم کسے بقافلہ بودہ ست پاسباں   بیدار شو کہ چشمِ رفیقاں بخواب شد

سوچتا ہوں، تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دُنیا سے اُلٹی ہی چال میرے حصے میں آئی۔ دُنیا کے لیے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا، وہی میرے لیے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ خوابِ شیریں کے مزے لیں۔ میں اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت یاب ہوتا رہوں:

خلق را بیدار باید بود ز آبِ چشمِ من
ویں عجب کاں دم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اِس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جرأتوں کا سرے سے موقعہ ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں۔ جب سو جاتی ہے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں:

خوابِ غفلت ہمہ را بردہ و بیدار یکے ست!

خلائق کے کتنے ہی ہجوم میں ہوں۔ لیکن اپنا وقت صاف بچا لیجاتا ہوں۔ کیونکہ میری اس خلوت در انجمن پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ میرے عیش و طرب کی بزم اُس وقت آراستہ ہوتی ہے جب نہ کوئی آنکھ دیکھنے والی ہوتی ہے، نہ کوئی کان سُننے والا۔ رضی دانش نے میری زبان سے کہا تھا:

خوش زمزمۂ گوشۂ تنہائی خویشم
از جوش و خروشِ گُل و بلبل خبرم نیست!

ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی۔ صبح کی اس مہلت میں تھوڑی سی آگ جو سلگ جاتی ہے، اُس کی چنگاریاں بُجھنے نہیں پاتیں۔ راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں:

اذاں بہ دیرِ مغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نہ میرد، ہمیشہ در دلِ ماست

دن بھر اگر سوز و تپش کا سامان نہ بھی ملے، جب بھی چولھے کے ٹھنڈے پڑ جانے کا اندیشہ نہ رہا۔ عرفی کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

سینۂ گرم نہ داری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عود مخر!

اس سحر خیزی کی عادت کے لیے والد مرحوم کا منت گزار ہوں۔ اُن کا معمول تھا کہ رات کی پچھلی پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے۔ بیماری کی حالت بھی اس معمول میں فرق نہیں ڈال سکتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ رات کو جلد سونا اور صبح جلد اُٹھنا زندگی کی سعادت کی پہلی علامت ہے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات سُناتے کہ دہلی میں مفتی صدر الدین مرحوم سے صبح کی سُنت و فرض کے درمیان سبق لیا کرتا تھا اور اس امتیاز پر نازاں رہتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے، مجھے خصوصیت کے ساتھ اوروں سے علیحدہ سبق دیں، اور اس کے لیے صرف وہی وقت نکل سکتا تھا۔ یہ بھی فرماتے کہ یہ فیض مجھے اپنے نانا رکن المدرسین سے ملا۔ وہ بھی شاہ عبدالعزیزؒ سے علی الصباح سبق لیا کرتے تھے اور پچھلی پہر سے اُٹھ کر اس کی طیاری میں لگ جاتے تھے۔ پھر خواجہ شیراز کا یہ مقطع ذوق لے لے کر پڑھتے

مرو بخواب کہ حافظ بہ بارگاہِ قبول
ز وردِ نیم شب و درسِ صبح گاہ رسید

میری ابھی دس گیارہ برس کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئی تھیں۔ بچپنے کی نیند سر پر

سوار رہتی تھی، مگر میں اس سے لڑتا رہتا۔ صبح اندھیرے میں اُٹھتا اور شمع دان روشن کر کے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہنوں سے منتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے تو مجھے جگا دینا۔ وہ کہتی تھیں، یہ نئی شرارت کی کیا سوجھی ہے۔ اس خیال سے کہ میری صحت کو نقصان نہ پہنچے، والد مرحوم روکتے، لیکن مجھے کچھ ایسا شوق پڑ گیا تھا کہ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی، دن بھر پشیمان سا رہتا۔ آنے والی زندگی میں جو معاملات پیش آنے والے تھے، یہ اُن سے میرا پہلا سابقہ تھا:

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھویٰ

فصادف قلباً فارغاً فتمکنا

دیکھیے، یہاں "پہلا سابقہ" لکھتے ہوئے میں نے عربی کی ترکیب "کان اول عھدی بھا" کا بلا قصد ترجمہ کر دیا کہ دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اور عالمِ تنہائی کی خلوت اندوزیوں کا پورا پورا لطف اُٹھا رہا ہوں۔ گویا ساری دنیا میں اس وقت میرے سوا کوئی نہیں بستا۔ کہہ نہیں سکتا، تنہائی کا یہ احساس میری طبعِ خلوت پرست کی جولانیوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا کرتا ہے۔ بیدل کی خیال بندیوں کا غلو بے کیف ہو، لیکن اس کی بحرِ طویل کی بعض غزلیں کیفیت سے خالی نہیں ہیں:

ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ

تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ؛ درِ دل کشا، بہ چمن درآ

پےٴ نافہ ہائے خجستہ بو، مپسند زحمتِ جستجو،

بخیالِ حلقۂ زلفِ او، گرہے خورد بہ ختن درآ

پانچ بجے سے قلعہ میں ٹینکوں کے چلانے کی مشق شروع ہوتی ہے اور گھر گھر کی آواز آنے لگتی ہے مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ چار بجے دودھ کی لاری آتی ہے اور چند لمحوں کے لیے صبح کا سکون ہنگامہ سے بدل دیتی ہے۔ وہ ابھی چند منٹ ہوئے، آئی تھی اور واپس گئی۔ اگر اس وقت کے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے تو وہ صرف جواہر لال کے ہلکے خراٹوں کی آواز ہے۔ وہ ہمسایہ میں سو رہے ہیں۔ صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسب معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے:

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم!

مؤتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری محمد شاہی امراء میں سے تھا۔ اس کا ایک مطلع آپ نے تذکروں میں دیکھا ہوگا۔ ضلع جگت کی صنعت گری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر جب کبھی جواہر لال کو انگریزی میں بڑبڑاتے سنتا ہوں تو بے اختیار یاد آجاتا ہے:

زبسکہ در دلِ تنگم خیالِ آں گل بود   نفیرِ خوابِ من امشب صفیرِ بلبل بود

یہ نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً انھی طبیعتوں پر طاری

ہوتی ہے جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت بھی سرتاسر جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس لیے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے رہتے ہیں۔

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔ فوجی صیغہ نے ہمارا چارج لے لیا، داخلہ کے وقت فہرست سے مقابلہ کر لیا، ہماری حفاظت کا اور دنیا سے بے تعلقی کا جس قدر بندوبست کیا جا سکتا تھا، وہ بھی کر لیا، لیکن اس سے زیادہ انھیں ہمارے معاملات سے کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ اندر کا تمام انتظام گورنمنٹ بمبئی کے ہوم ڈپارٹمنٹ نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اصلی رشتۂ کار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں یہاں رکھنے کے لیے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنے ۸۔ اگست کو یرودا سنٹرل جیل پونا سے ایک سینیر جیلر یہاں بھیج دیا گیا۔ دس جیل کے وارڈرز اور پندرہ قیدی کام کاج کے لیے اس کے ساتھ آئے۔ جیلر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا صورتِ حال پیش آنے والی ہے۔ صرف اتنی بات بتلائی گئی تھی کہ ایک ڈیٹنشن کیمپ (Detention Camp) کھل رہا ہے۔ چند دنوں کے لیے دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ ہم پہنچے تو معاملہ ایک دوسری ہی شکل میں نمایاں ہوا اور بیچارہ سراسیمہ ہو کر رہ گیا۔ چونکہ میں نے یہاں آتے ہی اپنا غصہ اس غریب پر نکالا

تھا، اس لیے کئی دن تک مُنہ چھپائے پھرتا رہا۔ جب اور کچھ نہ بنتی تو ضلع کے کلکٹر کے پاس دوڑا ہوا جاتا۔ وہ اس سے زیادہ بے خبر تھا:

درِ ہر کس کہ زدم، بے خبر و غافل بود

دوسرے دن کلکٹر اور سول سرجن آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔ سول سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھوک بجا کے دیکھتا رہا کہ کیا آواز نکلتی ہے؟ معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنی چاہتا تھا یا دلوں کی۔ مجھ سے بھی معائنہ کی درخواست کی۔ میں نے کہا۔ میرا سینہ دیکھنا بے سود ہے۔ اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے تو اُسے کام میں لائیے:

بگزر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق ۔۔۔ یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر ست

بہرحال چوتھے دن انسپکٹر جنرل آف پریزن آیا، اور گورنمنٹ کے احکام کا پرچہ حوالہ کیا۔ کسی سے ملاقات نہیں کی جا سکتی۔ کسی سے خط و کتابت نہیں کی جا سکتی۔ کوئی اخبار نہیں آ سکتا۔ ان باتوں کے علاوہ اگر کسی اور بات کی شکایت ہو تو حکومت اُس پر غور کرنے کے لیے طیار رہے۔ اب اِن باتوں کے بعد اور کونسی بات رہ گئی تھی جس کی شکایت کی جاتی اور حکومت از راہِ عنایت اسے دور کر دیتی؟

زباں جلائی، کیے قطع ہاتھ پہنچوں سے
یہ بندوبست ہوئے ہیں مری دُعا کے لیے!

انسپکٹر جنرل نے کہا۔ اگر آپ کتابیں یا کوئی اور سامان گھر سے منگوانا چاہیں تو اُن کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں۔ گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دیگی۔ چونکہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے میرے پاس دو کتابوں کے سوا جو راہ میں دیکھنے کے لیے ساتھ رکھ لی تھیں مطالعہ کا کوئی سامان نہ تھا۔ خیال ہوا، اگر مکان سے بعض مسودات اور کچھ کتابیں آجائیں تو قید و بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے۔ بظاہر اس خواہش میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی۔ دنیا را بہ اُمید خوردہ اند۔ آرزو عیب نہ دارد:

نقاب چہرۂ اُمید باشد گردِ نومیدی
غبارِ دیدۂ یعقوب آخر توتیا گردد

میں نے مطلوبہ اشیاء کا ایک پرچہ لکھ کر اُس کے حوالہ کیا اور وہ لے کر چلا گیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد جب صورتِ حال پر زیادہ غور کرنے کا موقعہ ملا، تو طبیعت میں ایک خلش سی محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی کہ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اُٹھانے پر راضی ہو گئی جب عزیز و اقربا سے بھی ملنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا، تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کر دیگی؟ ایسی حالت میں عزتِ نفس کا تقاضہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے، نہ کوئی

توقع رکھی جائے:

زتیغِ بے نیازی تا توانی قطع ہستی کن
فلک تا افگنداز پا ترا، خود پیش دستی کن

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا کہ فہرست کا پرچہ واپس کر دیا جائے۔ جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرزِ عمل قائم رہتا ہے، میں کوئی چیز مکان سے منگوانی نہیں چاہتا۔ یہاں اور تمام ساتھیوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا:

دامن اُس کا تو بھلا دور ہی اے دستِ جنوں
کیوں ہی بیکار؟ گریباں تو مرا دور نہیں!

اب چائے کے تیسرے فنجان کے لیے کہ ہمیشہ اس دورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے، ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ افسانہ سرائی ختم کرتا ہوں۔ یادش بخیر، خواجۂ شیراز کے پیرمے فروش کی موعظت بھی وقت پر کیا کام دے گئی ہے:

دی پیرمے فروش کہ ذکرش بخیر باد
گفتا "شراب نوش و غمِ دل ببر زیاد"
گفتم "بباد می دہدم بادہ نام و ننگ"
گفتا "قبول کن سخن و ہرچہ باد باد"
بے خار گل نہ باشد و بے نیش نوش ہم
تدبیر چیست؟ وضعِ جہاں ایں چنیں فتاد
پُر کن ز بادہ جام دمادم بگوشِ ہوش
بشنو از و حکایتِ جمشید و کیقباد"

ابوالکلام

قلعۂ احمد نگر

۱۹۔ اگست ۱۹۴۲ء

چو تخمِ اشک بہ کلفت سرشتہ اندمرا
بہ نااُمیدی جاوید کشتہ اندمرا

زآہ بے اثرم داغ خام کاری خویش
زرشتے کہ نہ دارم، برشتہ اندمرا

صدیق مکرم وہی صبح چار بجے کا وقت ہے۔ چائے سامنے دھری ہے۔ جی چاہتا ہے، آپ کو مخاطب تصور کروں اور کچھ لکھوں مگر لکھوں تو کیا لکھوں؟ مرزا غالب نے رنج گراں نشیں کی حکایتیں لکھی تھیں۔ صبرِ گریزپا کی شکایتیں کی تھیں:

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیے
کبھی شکایتِ صبرِ گریزپا کہیے!

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں۔ نہ صبر کی گریزپائیاں ہیں کہ سُناؤں۔ رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں۔ صبر کی جگہ رنج کی گریزپائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔ عرفی کا وہ شعر کیا خوب ہے جو ناصر علی نے اس کے تمام کلام میں سے چُنا تھا:

من ازیں رنج گرانبار چہ لذت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند!

اگر اس شعر کو اپنی حالت پر ڈھالنے کی کوشش کروں تو یہ ایک طرح کی خودستائی

اور خویشتن بینی کی بے صرفگی سمجھی جائیگی لیکن یہ کہنے میں کیا عیب ہے کہ اس مقام کی لذت شناسی سے بے بہرہ نہیں ہوں اور اس کا آرزومند رہتا ہوں! اسی عرفی نے یہ بھی تو کہا ہے۔

منکر نہ تواں گشت اگر دم زنم از عشق

ایں نشۂ بہ من گر نہ بود، با دگرے ہست!

یہاں پہنچنے کے بعد چند دنوں تک تو صرف جیلر ہی سے سابقہ رہا۔ ایک دو مرتبہ کلکٹر اور سول سرجن بھی آئے۔ پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا اُسی دن ایک اور شخص بھی اُس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا، آئی، ایم، ایس سے تعلق رکھتا ہے میجر ایم سینڈک (Sendak) نام ہے، اور یہاں کے لیے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے۔ میں نے جی میں کہا۔ یہ سینڈک، بینڈک کون کہے؟ کوئی اور نام ہونا چاہیے جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ معاً حافظہ نے یاد دلایا کہ کہیں نظر سے گزرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں اس قلعہ کا قلعہ دار چیتہ خاں نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے اِن حضرت کا نام چیتہ خاں ہی رکھ دیا کہ اوّل بہ آخر نسبتے دارد:

نام اُس کا آسماں ٹھہرالیا تحریر میں!

ابھی دو چار دن بھی نہیں گذرے تھے کہ یہاں ہر شخص کی زبان پر چیتہ خاں تھا۔ قیدی اور وارڈرز بھی اسی نام سے پکارنے لگے۔ کل جیلر کہتا تھا کہ آج چیتہ خاں

چلا گیا۔ میں نے کہا چینہ خاں کون؟ کہنے لگا میجر آور کون؟

ماہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد!

بہرحال غریب جیلر کی جان چھٹی۔ اب سابقہ چینہ خاں سے رہتا ہے جب جاپانیوں نے انڈیمین پر قبضہ کیا تھا تو یہ وہیں متعین تھا۔ اس کا تمام سامان غارت گیا۔ اپنی بربادیوں کی کہانیاں یہاں لوگوں کو سناتا رہتا ہے:

اگر ما دردِ دل داریم، زاہد دردِ دیں دارد!

اس مرتبہ سب سے زیادہ اہتمام اس بات کا کیا گیا ہے کہ زندانیوں کا کوئی تعلق باہر کی دنیا سے نہ رہے۔ حتیٰ کہ باہر کی پرچھائیں بھی یہاں نہ پڑنے پائے غالباً ہمارا محلِ قیام بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اب گویا احمد نگر بھی جنگ کے پُراسرار مقامات کی طرح سم ویران انڈیا (Somewhere in India) کے حکم میں داخل ہو گیا۔ دیکھیے، ناسخ کا ایک فرسودہ شعر یہاں کیا کام دے گیا ہے:

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گُم ہو وہ نگیں جس پہ کُھدے نام ہمارا

قلعہ کی جس عمارت میں ہم رکھے گئے ہیں، یہاں غالباً چھاؤنی کے افسر رہا کرتے تھے۔ گاہ گاہ جنگی قیدیوں کے لیے بھی اسے کام میں لایا گیا ہے۔ جنگ بوئر کے زمانے میں جو قیدی ہندوستان لائے گئے تھے اُن کے افسروں کا ایک گروہ یہیں رکھا گیا تھا گزشتہ جنگ میں بھی ہندوستان کے جرمن یہیں نظر بند کیے گئے۔

موجودہ جنگ میں بھی اطالوی افسروں کا ایک گروہ جو مصر سے لایا گیا تھا، یہیں نظر بند رہا۔

چیتہ خاں کہتا ہے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں فوجی افسروں کے ٹریننگ کی ایک کلاس کھولی گئی تھی۔ کل میرے کمرے میں الماری ہٹا کر اس نے دکھایا کہ ایک بڑا سیاہ بورڈ دیوار پر بنا ہے۔ میں نے جی میں کہا۔ غالباً اسی لیے ہمیں یہاں لا کر رکھا گیا ہے کہ ابھی درس گاہِ جنون و وحشت کے کچھ سبق باقی رہ گئے تھے؛

درین تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم
نہ دانم کے سبق آموز خواہم شد بہ دیوانش!

احاطہ کے مغربی رُخ پر جو کمرے ہیں اور جو ہمیں رہنے کے لیے دیے گئے ہیں، ان کی کھڑکیاں قلعہ کے احاطہ میں کھلتی ہیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشندان بھی ہیں۔ اس خیال سے کہ ہماری طرح ہماری نگاہیں بھی باہر نہ جاسکیں، تمام کھڑکیاں دیواریں چُن کر بند کردی گئی ہیں۔ دیواریں ہمارے آنے سے ایک دن پہلے چنی گئی ہونگی۔ کیونکہ جب ہم آئے تھے تو سفیدی خشک نہیں ہوئی تھی۔ ہاتھ پڑجاتا تو اپنا نقش بٹھا دیتا، اور نقش اس طرح بیٹھتا کہ پھر اٹھتا نہیں:

ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

دیواریں اس طرح چنی ہیں کہ اوپر تلے، دہنے بائیں، کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا روشندان تک چھپ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کھڑکیاں کھلی بھی ہوتیں، تو کونسا بڑا میدان سامنے کھل جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قلعہ کی سنگی دیواروں تک نگاہیں جاتیں اور ٹکراکر واپس آجاتیں۔ لیکن ہماری نگاہوں کی اتنی رسائی بھی خطرناک سمجھی گئی۔ روشندان کے آئینے تک بند کردیے گئے:

هوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

قلعہ کے دروازے کی شب وروز پاسبانی کی جاتی ہے اور قلعہ کے اندر بھی مسلح سنتری چاروں طرف پھرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ہماری حفاظت کے لیے مزید روک تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہمارے احاطہ کا شمالی رُخ پہلے کھلا تھا۔ اب دس دس فٹ اونچی دیواریں کھینچ دی گئی ہیں اور ان میں دروازہ بنایا گیا ہے، اور اس دروازے پر بھی رات دن مسلح فوجی پہرہ رہتا ہے۔ فوج یہاں تمام تر انگریز سپاہیوں کی ہے۔ وہی ڈیوٹی پر لگائے جاتے ہیں۔ جیلر اور ایک وارڈر کے سوا جسے بازار سے سودا سلف لانے کے لیے نکلنا پڑتا ہے، اور کوئی شخص باہر نہیں جاسکتا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو کوئی دروازے سے گزرے سنتری کو جامہ تلاشی دے۔ وارڈر کو ہر مرتبہ برہنہ ہوکر تلاشی دینی پڑتی ہے۔ وہ جیلر کے پاس جاجاکر روتا ہے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ پہلے دن جیلر نکلا تھا

تو اُس سے بھی جامہ تلاشی کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ "ایں ہم بچۂ شتر است!"

بازار سے سودا سلف لانے کا انتظام یوں کیا گیا ہے کہ قلعہ کے دروازے کے پاس فوجی ادارہ کا ایک دفتر ہے۔ یہاں کے سپرنٹنڈنٹ کا آفس ٹیلی فون کے ذریعہ اس سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جب بازار سے کوئی چیز آتی ہے تو پہلے وہاں رکی جاتی ہے اور اُس کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ پھر وہاں کا متعینہ افسر سپرنٹنڈنٹ کو فون کرتا ہے کہ فلاں چیز اس طرح کی اور اس شکل میں آئی ہے۔ مثلاً ٹوکری یا ہے یا رومال میں بندھی ہے، یا ٹین کا ڈبہ ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر یہاں سے جیلر احاطہ کے دروازے پر جاتا ہے اور نشان زدہ سامان سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں اُٹھوا لے جاتا ہے۔ اب یہاں پھر دوبارہ دیکھ بھال کی جاتی ہے اگر ٹوکری ہے تو اُسے خالی کرکے اُس کا ہر حصہ اچھی طرح دیکھ لیا جائیگا کہ ادھر اُدھر کوئی پرچہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ شکر اور آٹے کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کیونکہ ان کی تہہ میں بہت کچھ چھپا کر رکھ دیا جا سکتا ہے!

وارڈر جو پونا سے یہاں لائے گئے ہیں، وہ آئے تو تھے قیدیوں کی نگرانی کرنے مگر اب خود قیدی بن گئے ہیں۔ نہ تو احاطہ سے باہر قدم نکال سکتے ہیں۔ نہ گھر سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ جیلر کو بھی گھر خط لکھنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے، انھی راہوں سے کوئی خبر باہر پہنچ جائے۔ وہ رو رہا ہے کہ مجھے صرف ایک دن کی چھٹی ہی مل جائے کہ پونا ہو آؤں، مگر

کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ یہاں جسے دیکھو، ہائے ہائے کر رہا ہے:

شبنم خرابِ مہر، کتاں سینہ چاکِ ماہ،

لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں!

اس صورتِ حال نے یہاں کی ضروریات کی فراہمی میں عجیب عجیب اُلجھاؤ ڈال دیے ہیں۔ چینہ خاں جب دیکھو کسی نہ کسی گرہ کے کھولنے میں اُلجھا ہوا ہے مگر گرہیں ہیں کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ سب سے پہلا مسئلہ باورچی کا پیش آنا تھا اور پیش آیا۔ باہر کا کوئی آدمی رکھا نہیں جا سکتا، کیونکہ وہ قیدی بن کر رہنے کیوں لگا؟ اور قیدیوں میں ضروری نہیں کہ باورچی نکل آئے۔ قیدی باورچی جبھی مل سکتا ہے کہ پہلے کوئی قرینہ کا باورچی ذوقِ جرائم پیشگی میں اتنی ترقی کرے کہ پکڑا جائے، اور پکڑا بھی جائے کسی اچھے خاصے جرم میں کہ اچھی مدت کے لیے سزا دی جا سکے۔ لیکن ایسا حُسنِ اتفاق گاہ گاہ ہی پیش آ سکتا ہے، اور آج کل تو سوءِ اتفاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ کے باورچیوں میں کوئی مردِ میدان رہا ہی نہیں۔ انسپکٹر جنرل جب آیا تھا تو کہتا تھا، یروداجیل میں ہر گروہ اور پیشے کے قیدی موجود ہیں مگر باورچیوں کا کال ہے۔ نہیں معلوم ان کمبختوں کو کیا ہو گیا ہے:-

کس نہ دارد ذوقِ مستی، مے گساراں را چہ شد

جو قیدی یہاں چُن کر کام کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں، اُن میں سے دو

قیدیوں پر باورچی ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے:

ستم رسیدہ یکے، نا اُمیدوار یکے!

حالانکہ دونوں اس الزام سے بالکل معصوم واقع ہوئے ہیں اور زبانِ حال سے نظیری کا یہ شعر دہرا رہے ہیں۔ داد دیجیے گا، کہاں کی بات کہاں لاکر ڈالی ہے، اور کیا برمحل بیٹھی ہے:

تا منفعل ز رنجشِ بیجا نہ بینمش / می آرم اعترافِ گناہِ نہ بودہ را

چیتہ خاں یہاں آتے ہی اس عقدۂ لاینحل کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ روز اپنی طلب و جستجو کی ناکامیوں کی کہانیاں سناتا:

اگر دستے کنم پیدا، نمی یابم گریباں را!

ایک دن خوش خوش آیا اور یہ خبر سنائی کہ ایک بہت اچھے باورچی کا شہر میں انتظام ہوگیا ہے۔ کلکٹر نے ابھی فون کے ذریعہ خبر دی ہے کہ کل سے کام پر لگ جائیگا:

صبا بہ خوش خبری ہدہدِ سلیمان ست
کہ مژدۂ طرب از گلشنِ سبا آورد

دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا، طباخِ موعود یہی ہے:

آخر آمد پسِ پردۂ تقدیر پدید!

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا، لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا، جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا۔ اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا:

اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا!

بعد کو اس معاملہ کی جو تفصیلات کھلیں، اُن سے معلوم ہوا کہ یہ شکار واقعی کلکٹر ہی کے جال میں پھنسا تھا۔ کچھ تو اُس کے زورِ حکومت نے کام دیا، کچھ ساٹھ روپیے ماہانہ تنخواہ کی ترغیب نے، اور یہ اجل رسیدہ دام میں پھنس گیا۔ اگر اسے بعافیت قلعہ میں فوراً پہنچا دیا جاتا، تو ممکن ہے، کچھ دنوں تک جال میں پھنسا رہتا، لیکن اب ایک اور مشکل پیش آ گئی۔ یہاں کے کمانڈنگ افیسر سے باورچی رکھنے کے بارے میں ابھی بات چیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ پونا کے صدر دفتر کی ہدایت کا انتظار کر رہا تھا، اور اس لیے اس شکار کو فوراً قلعہ کے اندر لے نہیں سکتا تھا۔ اب اگر اسے اپنے گھر جانے کا موقعہ دیا جاتا ہے، تو اندیشہ ہے کہ شہر میں چرچا پھیل جائیگا، اور بہت ممکن ہے، کوئی موقعہ طلب اس معاملہ سے بروقت فائدہ اُٹھا کر باورچی کو نامہ و پیام کا ذریعہ بنالے۔ اگر روک لیا جاتا ہے، تو پھر رکھا کہاں جائے کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ جگہ ہو، اور باہر کا کوئی آدمی وہاں تک پہنچ نہ سکے؟

یہ بعد از انفصال اب آور ہی جھگڑا نکل آیا!

اسے کلکٹری کے یارانِ طریقت کی عقلمندی سمجھیے یا بے وقوفی کہ اسے بہلا پھسلا کر یہاں کے مقامی قید خانہ میں بھیج دیا، کیونکہ اُن کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قید خانہ کی کوٹھری ہی تھی۔ قید خانہ میں جو اُسے ایک رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا تو بھوننے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپیے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑینگے؟ اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی طیار ہو گیا؛

کہ عشق آساں نمود اول، ولے اُفتاد مُشکلہا!

بہر حال دو دن تو اُس نے کسی نہ کسی طرح نکال دیے تیسرے دن ہوش و حواس کی طرح صبر و قرار نے بھی جواب دے دیا۔ میں صبح کے وقت کمرے کے اندر بیٹھا لکھ رہا تھا کہ اچانک کیا سُنتا ہوں، جیسے باہر ایک عجیب طرح کا مخلوط شور و غل ہو رہا ہو "مخلوط" اس لیے کہنا پڑا کہ صرف آواز ہی کا غل نہیں تھا، رونے کی چیخیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی آدمی دم گھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہتا جاتا ہے اور پھر بیچ بیچ میں رو بھی جاتا ہے۔ گویا وہ صورتِ حال ہے جو خسرو نے سختی کشانِ عشق کی سنائی تھی کہ:

قدرے گریدا و ہم بر سرِ افسانہ رود!

باہر نکلا تو سامنے کے برآمدے میں ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ چیتہ خاں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہے، سامنے باورچی زمین پر لوٹ رہا ہے، تمام وارڈورز حلقہ باندھے کھڑے ہیں، قیدیوں کی قطار صحن میں صف بستہ ہو رہی ہے، اور ہمارے قافلہ کے تمام زندانی بھی ایک ایک کر کے کمروں سے نکل رہے ہیں۔ گویا اس خرابہ کی ساری آبادی وہیں سمٹ آئی ہے:

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں!

چیتہ خاں کہہ رہا ہے، تمہیں کوئی اختیار نہیں کہ یہاں سے نکلو۔ باورچی چیختا ہے کہ مجھے پورا اختیار ہے۔ تمہیں کوئی اختیار نہیں کہ مجھے روکو۔ جبر و اختیار (Determinism and Freewill) کا یہ مناظرہ سُن کر مجھے بے اختیار نعمت خاں عالی کا وہ قطعہ یاد آگیا جو اُس نے مختار خاں کی ہجو میں کہا تھا اور جس کی شرح لکھنے میں صاحبِ خزانۂ عامرہ نے بڑی مغز پاشی کی ہے:

ایں دلیل از جبر می آورد او از اختیار

ایں سخن ہم درمیاں ماندہ ست امرِ بَین بَین

باورچی اُن لوگوں میں معلوم ہوتا تھا جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ:

قومے بہ جدّ و جہد گرفتند وصلِ دوست

مگر چیتہ خاں اس پر زور دیتا تھا کہ:

قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند!

جیلر نے خیال کیا کہ حقیقتِ حال کچھ ہی ہو، مگر "بین الجبر والاختیار"[1] کا مذہب اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔ اُس کی نظر اشاعرہ کے "کسب" اور شوپن ہار (Schopenhauer) کے "ارادہ" پر گئی:

گناہ گرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظ
تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من ست

اس نے باورچی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح کی ہٹ ٹھیک نہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایک مہینا نکال دو۔ پھر تمہیں گھر جانے کی اجازت مل جائیگی:

مُرغِ زیرک چوں بہ دام اُفتد تحمل بایدش

لیکن اس کا معاملہ اب نصیحت پذیریوں کی حد سے گزر چکا تھا:

نِکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

ایک مہینے کی بات جو اُس نے سُنی، تو اور کپڑے پھاڑنے لگا:

دل سے دیوانے کو مت چھیڑ، یہ زنجیر نہ کھینچ!

---

[1] یعنے "ڈیٹر من ازم" اور "فری وِل" کے درمیان راہ نکالنے کا مذہب جیسا کہ مسلمان متکلمین میں اشاعرہ نے اختیار کیا۔ وہ کہتے ہیں اگرچہ انسان خدا کی قدرت کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا مگر اُسے "کسب" کی قوت حاصل ہے یعنے ارادہ کے ساتھ کام کرنے اور اس کے اثرات کسب کرنے کی قوت حاصل ہے۔ اگرچہ اس کا ارادہ بھی خود اُس کے بس کی چیز نہیں۔ دراصل اشاعرہ کا کسب بھی مذہب جبر کی ہی ایک دوسری تعبیر ہے۔ شوپن ہار نے اسی اعتقاد کو یوں تعبیر کیا کہ ہمارے تمام افعال کی تہہ میں ہمارا ارادہ کام کرتا ہے اگرچہ ہمارا ارادہ ہمارے اختیار میں نہیں۔

شام کو چیتہ خاں اس طرف آیا تو میں نے اُس سے کہا کہ اس طرح مجبور کر کے کسی آدمی کو رکھنا ٹھیک نہیں۔ اسے فوراً رخصت کر دیا جائے۔ اگر اُسے جبرًا رکھا گیا تو ہم اس کا پکایا ہوا کھانا چھونے والے نہیں۔ چنانچہ دوسرے دن اسے رہائی مل گئی۔ اتوار کے دن حسبِ معمول کلکٹر آیا تو معلوم ہوا جس دن چھوٹا تھا، اُسی دن اُس نے اپنا بوریا بستر سنبھالا اور سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رُخ کیا۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تک نہیں:

کردہ ام توبہ، واز توبہ پشیماں شدہ ام
کافرم، باز نہ گوئی کہ مسلماں شدہ ام

یہ تو باورچی کی سرگزشت ہوئی، لیکن یہاں کوئی دن نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی نئی سرگزشت پیش نہ آتی ہو۔ باورچی کے بعد حجّام کا مسئلہ پیش آیا۔ ابھی وہ حل نہیں ہوا تھا کہ دھوبی کے سوال نے سر اُٹھایا۔ چیتہ خاں کا سارا وقت ناخن تیز کرنے میں بسر ہوتا ہے، مگر رشتۂ کار میں کچھ ایسی گانٹھیں پڑ گئی ہیں کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ یہ وہی غالب والا حال ہوا کہ:

پہلے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اُمید میں گانٹھ
پیچھے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل!

ابوالکلام

حکایت بادۂ و تریاک

قلعہ احمد نگر
۲۷- اگست ۴۲ء

صدیق مکرم انسان اپنی زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے، مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی۔ ایک اندر کی۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست!

دونوں زندگیوں کے مرقع کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو نہ پہچان سکیں؛

لباس صورت اگر واژگوں کنم بینند
کہ خرقۂ پشمینم مایۂ طلا باف است

قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی اُفتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر نہیں آنا چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے

بارِ خاطر نہیں ہوتا لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں:

تا کے چو موجِ بحر بہر سو شتافتن
در عینِ بحر پائے چو گرداب بند کن!

لیکن جونہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے، میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریمِ دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور انہیں پھر سے آراستہ کر دوں:

دقتست دگر بتکدہ سازند حرم را!

اس تحوّلِ صورت (Metamorphism) کے عمل میں کہاں تک مجھے کامیابی ہوتی ہے؟ اس کا فیصلہ تو دوسروں ہی کی نگاہیں کر سکینگی لیکن خود میرے فریبِ حال کے لیے اتنی کامیابی بس کرتی ہے کہ اکثر اوقات اپنی پچھلی زندگی کو بھولا رہتا ہوں اور جب تک اس کے سُراغ میں نہ نکلوں، اُسے واپس نہیں لا سکتا:

دل کہ جمع ست، غم از بے سر و سامانی نیست
فکرِ جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست

اگر آپ مجھے اس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں، میری پچھلی زندگی مجھے قیدخانے

کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی، اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے۔ جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم، اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی، آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں۔ "ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوشگوار بناؤ" جس کا دستور العمل ہے:

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر، کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست!
پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داری
خوش بیاسائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست!

میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جزء رواقیہ (Stoics) کا ہے، ایک لذتیہ (Epicureans) کا

پنبہ را آشتی ایں جا بہ شرار افتاد ست!

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے اُن کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور اُن کی چُبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں:

ہر وقتِ بد کہ روئے دہد آب سیل دہاں
ہر نقشِ خوش کہ جلوہ کند موجِ آب گیر!

جہاں تک زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے، لذتیّہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں:

ہر وقتِ خوش کہ دست دہد مغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجامِ کار چیست؟

میں نے اپنے کاک تیل (Cocktail) کے جام میں دونوں بوتلیں انڈیل دیں میرا ذوقِ بادہ آشامی بغیر اس جامِ مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھیے کہ گویا حکایتِ بادۂ و تریاک میں نے تازہ کر دی ہے:

چناں افیون ساقی در مے افگند
حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار!

البتہ کاک تیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خامکار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گسارانِ کہن مشق ہی اسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (Vermuth) اور جن (Gin) کا مرکب پینے والے اس رطلِ گراں کے متحمل نہیں ہو سکینگے مولانائے روم نے ایسے ہی معاملات کی طرف اشارہ کیا تھا:

بادۂ آں در خورِ ہر ہوش نیست
حلقۂ آں سخرۂ ہر گوش نیست!

آپ کہینگے، قیدخانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے۔ لیکن لذتیّہ کی عشرت اندوزیوں کا

وہاں کیا موقعہ ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں، اُنہیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سر و سامان کہاں میسر آسکتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤنگا کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے۔ جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہ سے اُن کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم اُن کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اُس کی زبان لے لینی چاہی تھی:

ملے جو حشر میں، لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لیے

اور غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سرِ و سامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہانخانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ؟:

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اِک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا!

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اُس کا چمن خود اُس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پروں کو کھول دیگا، ایک چمنستانِ بوقلموں کھِل جائیگا:

نہ با صحرا سرے دارم، نہ با گلزار سودائے
بہ ہر جا می روم، از خویش می جوشد تماشائے!

قیدخانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے، اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تو وہ صرف قیدخانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں۔ اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئیگی، اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگیگی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائیگا۔ قیدخانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی اُنہیں دیکھ لیا کرینگی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شادکام رکھے کسی کو محروم کردے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اُٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا!

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہانتاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سر و سامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہینگے۔ مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھینگے۔ حالانکہ اگر اُسے ڈھونڈھ نکالیں، تو عیش و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہوا مل جائے:

بغیرِ دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست

ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا اینجاست!

ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سایے سے کام لے لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خود رو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسّر نہیں ہیں، تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے؟ اگر دنیا کی ساری

مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہوگئی ہیں تو ہو جائیں۔ صبح اب بھی ہر روز مُسکرائیگی۔ چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کریگی۔ لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدا را تبلائیے اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں؟ اُس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دینگے؟

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ! تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہی تیرے جینے سے!

میں آپ کو بتلاؤں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اُس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑیگی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اُجڑا، اور ساری دنیا اُجڑ گئی:

از صد سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد ست
"عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد ست!"

باہر کے سارے ساز و سامانِ عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست — واں دراں آئینہ صد گونہ تماشا میکرد
گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم؟ — گفت "آں روز کہ ایں گنبدِ مینا میکرد!"

آپ کو معلوم ہے، میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اُٹھتا ہوں

اور چائے کے پے بہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔ خواجۂ شیراز کی طرح میری صدائے حال بھی یہ ہوتی ہے کہ:

خورشیدِ مے زمشرقِ ساغر طلوع کرد
گر برگِ عیش می طلبی ترکِ خواب کن!

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُرکیف وقت ہوتا ہے، لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اُس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اُٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اُس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں، اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دَم دیتا ہوں، پھر جام و صراحی کو میز پر دہنی طرف جگہ دونگا کہ اُس کی اولیّت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھونگا کہ سرو سامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤنگا، اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤنگا! کسی بادہ گسار نے شامپین اور برگنڈی کے صد سالہ تہ خانوں کے عرقِ کہن سالی میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے:

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما!

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں۔ مگر خدا نخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشانِ کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیونگا، اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لونگا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائیگا تو کچھ دیر کے لیے رک جاؤنگا اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دونگا۔ پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤنگا، اور دنیا کو اور اُس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دونگا:

خوشتر از فکرِ مے و جام چہ خواہد بودن

تا بہ بینیم سرانجام چہ خواہد بودن!

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں، اُسی عالم میں ہوں، اور نہیں جانتا کہ ۹۔ اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا، اور اب کیا ہو رہا ہے:

شرابِ تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش کہ تا یک دم بیاسایم ز دنیا و شر و شورش

کمندِ صیدِ بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام ست نے گورش

میرا دوسرا پر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحتِ تعین کے ساتھ کہو تو

کہ زوال کا ہونا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں۔ پھر اُٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں، اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کرونگا، اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دونگا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں:

بازم بہ کلبہ کیست، نہ شمع و نہ آفتاب

بام و درم ز ذرّہ و پروانہ پُر شدہ ست!

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہے۔ یعنے زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائیے، اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی، اُس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا:

صنمم گفت کہ جز غم چہ ہُنر دارد عشق؟

گفتم "اے خواجۂ عاقل! ہنرے بہتر ازیں!"

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔

ایک پُرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے "سب سے زیادہ دانشمند آدمی کون ہے؟" پھر جواب دیا ہے "جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے" اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر لے سکتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے:

نہ ہر درخت تحمّل کند جفائے خزاں
غلامِ ہمتِ سروم کہ این قدم دارد!

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہُنر سیکھ لیا ہے، تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اَور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں:

چو مہمانِ خراباتی بعشرت باش با رنداں
کہ دردِ سر کشی جاناں، گراین مستی خمار آرد

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندری ژید (Andre Gide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اُس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے یعنے ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا۔ وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت،

دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں:

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را!

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بہ یک وقت سیکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر بھی غبار آجائیگا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائینگے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے، وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے۔ لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی۔ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں، اُس میں بھی دوسروں کا حصّہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کرسکیگی، اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائینگے ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں، اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے عرفی نے اپنے شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا تھا:

بدیدارِ تو دل شاد ند باہم دوستانِ تو
ترا ہم شادماں خواہم چو روئے دوستاں بینی!

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ، اور اخلاق، تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا

جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھریگا، اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی، اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔ گویا علم اور تقدس، دونوں کے لیے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔ توہین حیات صرف یونان کے کلبیہ (Cynics) ہی کا شعار نہ تھا، بلکہ رواقی (Stoic) اور مشائی (Peripatetic) نقطۂ نگاہ میں بھی اس کے عناصر برابر کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ افسردہ دلی اور ترش روئی فلسفیانہ مزاج کا ایک نمایاں خط و خال بن گئی۔ اخلاق سے اگر اس کے مذہب طمانیت و مسرت (Eudemonism) اور مادیاتی مذہب عشرت (Hedonism) کے تصورات مستثنیٰ کر دیجیے تو اس کا عام طبعی مزاج بھی فلسفیانہ سرکہ روئی سے خالی نہیں ملیگا۔ مذہب اور روحانیات کی دنیا میں تو زہدِ خشک اور طبع خنک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دینداری اور ثقالتِ طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہ قاآنی کو کہنا پڑا تھا:

اسبابِ طرب را ہمہ از مجلس بیروں

زاں پیش کہ ناگاہ ثقیلے رسد از در

آپ جانتے ہیں کہ اہلِ ذوق کی مجلسِ طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ نظامی گنجوی نے اِس

کی تصویر کھینچی تھی:

ہر چہ در جملہ بہ آفاق دریں جا حاضر
مومن و ارمنی و گبر و نصاریٰ و یہود!

لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی، تو وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بعض یارانِ بے تکلّف کو کہنا پڑا تھا:

در مجلس ما زاہد! زنہار تکلف نیست
البتہ تو می گنجی، عمّامہ نمی گنجد!

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سیکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی، آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے اُنہیں حل نہیں کر دے سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑیگا کہ ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اُس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنّم، اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں، اُس میں، ہم ایک بُجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرہ کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت

کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو، اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھِل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔ صائب کیا خوب کہہ گیا ہے۔

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی
کشادہ روئے تر از رازہائے مستاں باش!
تمیزِ نیک و بدِ روزگار کارِ تو نیست
چو چشمِ آئینہ، در خوب وزشت حیراں باش!

قلعہ احمد نگر

۲۹۔ اگست سنہ ۴۲ء

ایں رسم و راہِ تازہ ز حرمانِ عہد ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نہ بود

صدیقِ مکرم وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے۔ چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے، اور طبیعت درازنفسی کے لیے بہانے ڈھونڈھ رہی ہے جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکینگی۔ تاہم طبعِ نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ سُن رہے ہوں یا نہ سُن رہے ہوں، میرے ذوقِ مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے:۔

اگر نہ دیدی تپیدنِ دل، شنیدنی بود نالۂ ما!

بانسری اندر سے خالی ہوتی ہے مگر فریادوں سے بھری ہوتی ہے۔ یہی حال میر ا ہے:

بہ فسانۂ ہوسِ طرب، تہی از خودیم و پُر از طلب
چہ دمد ز صنعتِ صفرنے بجز اینکہ نالہ فزوں کند

قید و بند کے جتنے تجربے اس وقت تک ہوئے تھے، موجودہ تجربہ اُن سب

سے کئی باتوں میں نئی قسم کا ہوا۔ اب تک یہ صورت رہتی تھی کہ قید خانے کے قواعد کے ماتحت عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ نج کی خط و کتابت روکی نہیں جاتی تھی۔ اخبارات دیے جاتے تھے، اور اپنے خرچ سے منگوانے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔ خاص خاص حالتوں میں اس سے بھی زیادہ دروازہ کھُلا رہتا تھا۔ چنانچہ جہاں تک خط و کتابت اور ملاقاتوں کا تعلق ہے مجھے ہمیشہ زیادہ سہولتیں حاصل رہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ گو ہاتھوں میں زنجیریں اور پانوں میں بیڑیاں پڑ جاتی تھیں، لیکن کان بند نہیں ہو جاتے تھے اور آنکھوں پر پٹیاں نہیں بندھتی تھیں۔ قید و بند کی ساری رکاوٹوں کے ساتھ بھی آدمی محسوس کرتا تھا کہ ابھی تک اُسی دنیا میں بس رہا ہے جہاں گرفتاری سے پہلے رہا کرتا تھا:

زنداں بھی خیال بیاباں نورد تھا!

کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں اُن لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اونچا کر لے تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اُسے پریشان نہیں کر سکیگا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کر دی جا سکتی ہے، اور زندگی بہر حال بسر ہو ہی جاتی ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام؟
زیں ہوسہا بگزر یا نہ گزر، می گزرد!

یہ حالت انقطاع و تجرد کا ایک نقشہ بناتی تھی، مگر نقشہ ادھورا ہوتا تھا۔ اس طرح کا ادھورا انقطاع فی الحقیقت انقطاع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نہ تو باہر کے علاقے پوری طرح منقطع ہو جاتے تھے، نہ باہر کی صداؤں کو زنداں کی دیواریں روک سکتی تھیں:

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی لف کی یاد　　ہاں، کچھ اک رنجِ گرانبارئ زنجیر بھی تھا

لیکن اس مرتبہ جو حالت پیش آئی، اُس نے ایک دوسری ہی طرح کا نقشہ کھینچ دیا۔ باہر کی نہ صرف تمام صورتیں ہی یک قلم نظروں سے اوجھل ہو گئیں، بلکہ صدائیں بھی بہ یک دفعہ رگ گئیں۔ اصحاب کہف کی نسبت کہا گیا ہے کہ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا، تو ایسی ہی ضرب علی الآذان کی حالت ہم پر بھی طاری ہو گئی۔ گویا جس دنیا میں بستے تھے، وہ دنیا ہی نہ رہی:

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس، ولم یسمر بمکۃ سامر!

اچانک ایک نئی دنیا میں لا کر بند کر دیے گئے جس کا پورا جغرافیہ ایک سو گز سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا، اور جس کی ساری مردم شماری اگر ہم اپنے کو الگ کر لیں۔ تو پندرہ زندہ شکلوں سے زیادہ نہیں۔ اسی دنیا میں ہر صبح کی روشنی طلوع ہونے

لگی۔ اِسی میں ہر شام کی تاریکی پھیلنے لگی:

گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب!

اگر کہوں کہ اس ناگہانی صورتِ حال سے طبیعت کا سکون متاثر نہیں ہوا تو یہ صریح بناوٹ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہوئی اور تیزی اور شدت کے ساتھ ہوئی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حالت کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسب معمول علی الصباح اُٹھا اور جام دمینا کا دور گردش میں آیا، تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہوگیا ہو اور افسردگی و تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ ہا، مخلص خاں عالمگیری نے کیا خوب لف و نشر مرتب کیا ہے۔ اس ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجیے:

خمارِ ما، وُ درِ توبہ، وُ دلِ ساقی، بہ یک تبسّمِ مینا شکست و بست و کشاد!

اب معلوم ہوا کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دنیا کھوئی گئی ہے، مگر فکر و تصور کی کتنی ہی نئی دنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھُل جا سکتے ہیں تو کون ایسا زیاں عقل ہوگا جو اس سودے پر گلہ مند ہو:

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں!

باقی رہی قید و بند کی تنہائی اور علائق کا انقطاع، تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حالت کبھی میرے لیے موجبِ شکایت نہ ہو سکی۔ میں اس سے گریزاں نہیں رہتا اِس کا آرزو مند رہتا ہوں۔ تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں، ہمیرے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائیگی۔ باطنہ فیہ الرحمہ وظاہرہ من قبلہ العذاب۔

ابتدا ہی سے طبیعت کی اُفتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے، اس لیے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے، مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈھتی رہتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کامجوئیوں میں لگ گئی

درخرا باتم نہ دیدستی خراب　　　باده پنداری کہ پنہاں می زنم

لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوئر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے۔ اسے عام طور پر لال ڈِگی کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں۔ اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بینچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں اب بھی یہ جھنڈ

ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔ والد مرحوم کے خادم خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجلا جھنجلا کر کہتے "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلا کیوں؟" یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور اُن کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ جو برمی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا اور شاید اب بھی ہو، میں نے چُن لیا تھا، کیونکہ اس طرف لوگوں کا گزر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اس کے اندر گم رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آجاتا ہے تو دل کا عجیب حال ہوتا ہے:

عالمِ بے خبری طرفہ بہشتے بوداست
حیف صد حیف کہ ما زود خبردار شدیم!

کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کُن شہر تھا۔ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رُخ ہی نہیں کرتی تھی:

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیالِ ماہے
چہ کُنم کہ نفسِ بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

والد مرحوم میرے اس شوق علم سے خوش ہوتے مگر فرماتے۔ یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دیگا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری، مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی پنپ نہ سکا:

کے گفتہ بود کہ دردش دواپذیر مباد:

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا۔ اس لیے خلقت کا جو ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پانؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی و مشیخت کی اس حالت میں نو عمر طبیعتوں کے لیے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں برخود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے، اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصہ میں بھی آئے ہوں۔ کیونکہ اپنی چوریاں پکڑنے کے لیے خود اپنے کمین میں بیٹھنا جیسا کہ عرفی نے کہا ہے، آسان نہیں:

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش!

لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی اُفتاد مجھے بالکل دوسری ہی طرف لے جا رہی تھی۔ میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدتمندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا، بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کمیاب جنس ڈھونڈھتے ہیں اور ملتی نہیں۔ مجھے گھر بیٹھے ملی اور اس کا قدرشناس نہ ہو سکا:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!

البتہ اب سونچتا ہوں تو یہ معاملہ بھی فائدہ سے خالی نہ تھا، اور یہاں کا کونسا معاملہ ہے جو فائدہ سے خالی ہوتا ہے؟ یہی فائدہ کیا کم ہے کہ جس غذا کے لیے دنیا کی طبیعتیں للچاتی رہتی ہیں اُس سے پہلے ہی دن اپنا جی سیر ہو گیا اور طبیعت میں للچاہٹ باقی نہ رہی۔ فیضیؔ نے ایک شعر ایسا کہا ہے کہ اگر اور کچھ نہ کہتا جب بھی فیضیؔ تھا:

کعبہ را ویراں مکن اے عشق، کانجا یک نفس
گہ گہے بیس ماندگانِ راہ منزل می کنند!

طبیعت کی اس اُفتاد نے ایک بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے

میرے لیے بیکار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو، اَور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ اُن کا جو ہجوم لوگوں کو خوشحال کرتا ہے، میرے لیے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی۔ اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ ہم نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا:

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

اسی طرح اگر حالات کی رفتار قید و بند کا باعث ہوتی ہے، تو اس حالت کی جو رُکاوٹیں اور پابندیاں دوسروں کے لیے اذیت کا موجب ہوتی ہیں، میرے لیے یکسوئی اور بخود مشغولی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور کسی طرح بھی طبیعت کو افسردہ نہیں کر سکتیں۔ میں جب کبھی قید خانے میں سُنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیے سزا کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش، ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جا سکیں:

حسدِ تہمتِ آزادیِ سروم بگداخت — کیں مرادیست کہ بر تہمتِ آں ہم حسد است

ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے، مجھے ایک کوٹھری میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً طیار ہو گیا کہ مجھے ایسی جگہ رکھے جہاں اور لوگ بھی رکھے جا سکیں اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن حضرت سے کہا۔ آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی، مگر آپ کو معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی، وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھینی جا رہی ہے، یہ تو وہی غالب والا معاملہ ہوا کہ:

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے!

میں اپنی طبیعت کی اس اُفتاد سے خوش نہیں ہوں۔ نہ اسے کوئی حسن و خوبی کی بات سمجھتا ہوں۔ یہ ایک نقص ہے کہ آدمی بزم و انجمن کا حریف نہ ہو اور صحبت و اجتماع کی جگہ خلوت و تنہائی میں راحت محسوس کرے:

حریفِ صافی و دُردی نۂ، خطا اینجاست
تمیز ناخوش و خوش می کنی، بلا اینجاست

لیکن اب طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اُسے توڑا جا سکتا ہے، مگر موڑا نہیں جا سکتا:

قطرہ از تشویشِ موجِ آخر نہاں شد در صدف گوشہ گیری ہائے خلق از انفعالِ صحبت ست

اسی اُفتادِ طبیعت کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں، اور لوگوں کو حقیقتِ حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور و پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں، میں دوسروں کو سبکسر تصور کرتا ہوں، اس لیے ان کی طرف بڑھتا نہیں، حالانکہ مجھے خود اپنا ہی بوجھ اُٹھنے نہیں دیتا دوسروں کی فکر میں کہاں رہ سکتا ہوں؟ غنی کشمیری نے ایک شعر کیا خوب کہا ہے:

طاقتِ برخاستن از گردِ تمنا کم نہ ماند
خلق پندارد کہ مے خور دست و مست اُفتادہ است

سرخوش نے کلمات الشعراء میں جو شعر نقل کیا ہے، اس میں "خلق می داند" ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں، یہ محل "دانستن" کا نہیں ہے "پنداشتن" کا ہے، اس لیے "پندارد" زیادہ موزوں ہوگا اور عجب نہیں اصل میں ایسا ہی ہو۔

بہرحال جو صورتِ حال پیش آئی ہے، اُس سے جو کچھ بھی انقباضِ خاطر ہوا تھا، وہ صرف اس لیے ہوا تھا کہ باہر کے علائق اچانک یک قلم قطع ہو گئے اور ریڈیو سٹ اور اخبار تک روک دیے گئے، ورنہ قید و بند کی تنہائی کا کوئی شکوہ نہ پہلے ہوا ہے، نہ اب ہے:

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟

اور پھر جو کچھ بھی زبانِ قلم پر طاری ہوا، صورتِ حال کی حکایت تھی۔ شکایت نہ تھی۔ کیونکہ اس راہ میں شکوہ و شکایت کی تو گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں

اختیار رہے کہ اپنا سر ٹکراتے رہیں، تو دوسرے کو بھی اختیار رہے کہ نئی نئی دیواریں چنتا رہے۔ بیدل کا یہ شعر موجودہ صورتِ حال پر کیا چسپاں ہوا ہے:

دو رِپے دِ صلش طلسمِ اعتبارِ ما شکست
ورنہ ایں عجزے کہ می بینی، غبارِ ناز بود!

اگرچہ یہاں تنہا نہیں ہوں۔ گیارہ رفیق ساتھ ہیں لیکن چونکہ ان میں سے ہر شخص ازراہِ عنایت میرے معمولات کا لحاظ رکھتا ہے، اس لیے حسبِ دلخواہ یکسوئی اور مشغولیت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دن بھر میں صرف چار مرتبہ کمرہ سے نکلنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کھانے کا کمرہ قطار کا آخری کمرہ ہے، اور چائے اور کھانے کے اوقات میں وہاں جانا ضروری ہوا۔ باقی تمام اوقات کی تنہائی اور خود مشغولی بغیر کسی خلل کے جاری رہتی ہے:

خوش فرشِ بوریا و گدائی و خوابِ امن
کیں عیش نیست درخورِ اورنگِ خسروی!

زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا، سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں:

آئینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست   تصویرِ خود بہ لوحِ دگر می کشیم ما!

گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے مطالعہ کا کوئی سامان ساتھ

نہ تھا۔ صرف دو کتابیں میرے ساتھ گئی تھیں جو سفر میں دیکھنے کے لیے رکھ لی تھیں۔ اسی طرح دو چار کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہو گیا، اور مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن اگر پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا، تو لکھنے کے سامان کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے اور روشنائی کی احمد نگر کے بازار میں کمی نہیں۔ تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے:

درجنوں بیکار نہ تواں زیستن آتشم تیز ست و داماں می زنم

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے برآمدہ میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں یا صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں:

بیکاریِ جنوں میں ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

میں نے جو خط انسپکٹر جنرل کو لکھا تھا، وہ اُس نے گورنمنٹ کو بھیج دیا تھا۔ کل اس کا جواب ملا۔ اب نئے احکام ہمارے لیے یہ ہیں کہ اخبار دیے جائینگے قریبی رشتہ داروں کو خط لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ملاقات کسی سے نہیں کی جا سکتی۔ چیتہ خاں نے یہاں کے فوجی مس (Mess) سے ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ منگوا لیا تھا۔ وہ اُس نے خط کے ساتھ حوالہ کیا۔ اخبار کا ہاتھ میں لینا تھا کہ تین ہفتہ پہلے کی دنیا جو ہمارے لیے معدوم ہو چکی تھی، پھر سامنے آ کھڑی ہوئی

معلوم ہوا کہ ہمارے گرفتار ہو جانے سے ملک میں امن چین نہیں ہو گیا، بلکہ نئے ہنگاموں نے نئے غلغلے برپا کیے :-

ہے ایک خلق کا خون اشک خونفشاں پہ میرے
سکھائی طرز کسے دامن اُٹھا کے آنے کی!

میں نے چیتہ خاں سے کہا کہ اگر ۹۔ اگست سے ۲۰ ۔ تک کے پچھلے پرچے کہیں سے مل سکیں تو منگوا دے۔ اُس نے ڈھونڈھوایا تو بہت سے پرچے مل گئے۔ رات دیر تک انہیں دیکھتا رہا تھا:

دیوانگاں ہزار گریباں دریدہ اند
دستِ طلب بہ دامنِ صحرا نہ می رسد

مگر مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی ان معاملات کے لیے نہیں ہوا کرتی:

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

میری دُکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی۔ لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔ دیکھیے، اس چھان لینے کے مضمون کو شریف خاں شیرازی نے کہ جہانگیر کے عہد میں امیر الامراء ہوا، کیا خوب باندھا ہے:

شور نالہ بہ غربالِ ادب می بیزم   کہ بہ گوشِ تو مبادا رسد آوازِ درشت

یہ وہی امیرالامرا ہے جس کے حسب ذیل شعر پر جہانگیر نے شعراء دربار سے غزلیں لکھوائی تھیں اور خود بھی طبع آزمائی کی تھی:

بگزر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر است

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم آج غالباً صبح عید ہے۔ عید کی تبریک آپ تک پہنچا نہیں سکتا۔ البتہ آپ کو مخاطب تصور کر کے صفحۂ کاغذ پر نقش کر سکتا ہوں؛

اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشینِ دل می گویمت دعا و ثنا می فرستمت!

در راہِ دوست مرحلۂ قرب و بُعد نیست می بینمت عیاں و دعا می فرستمت!

اپنی حالت کیا لکھوں؟

خمیازہ سنجِ تہمتِ عیش رمیدہ ایم

مے آں قدر نہ بود کہ رنج خمار بُرد!

معلوم نہیں، ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی۔ گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اُٹھیگی، جیسے اِسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح اُبھر آئینگے کہ معلوم ہوگا، ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اُٹھا ہوں۔ مضمون کے ساتھ کتاب یاد

آجاتی ہے، کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ، اور صفحہ کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا، یا درمیانی سطروں میں، یا آخری سطروں میں۔ نیز صفحہ کا رُخ کہ دہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، حسب معمول سو کر اُٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا:

کم لذّتم و قیمتم افزوں ز شمار ست
گوئی ثمرِ پیشترا ز باغِ وجودم!

ساتھ ہی یاد آگیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے جو اواخر عہد اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہجہاں کے عہد تک زندہ رہا، اور آفتاب عالم تاب میں نظر سے گذرا تھا۔ غالباً بائیں طرف کے صفحہ میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم تاب دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہونگے۔ پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اُسے کھولا ہو۔

غور فرمائیے۔ کیا عمدہ مثال دی ہے۔ آپ نے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہونگے۔ مثلاً جاڑوں میں آم۔ چونکہ بے فصل کی چیز ہوتی ہے، نایاب اور تحفہ سمجھی جاتی ہے۔ لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں اور دوستوں کو بطور تحفہ کے بھیجتے ہیں۔ لیکن جو علّت اس کی تحفگی اور گرانی کی ہوئی، وہی بے لذتی کی بھی ہو گئی۔ کھائیے تو مزہ نہیں ملتا۔ اور مزہ ملے تو کیسے ملے؟ جو موسم

ابھی آیا نہیں، اُس کا میوہ ناوقت پیدا ہو گیا۔ یہ زمین کی غلط اندیشی تھی کہ وقت کی پابندی بھول گئی، اور اس غلط اندیشی کی پاداش ضروری ہے کہ میوہ کے حصے میں آئے۔ تاہم چونکہ چیز کمیاب ہوتی ہے، اس لیے بے مزہ ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتی۔ کھانے والوں کو مزہ نہیں ملتا۔ پھر بھی زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خریدینگے اور کہینگے، یہ جنس نایاب جتنی بھی گراں ہو، ارزاں ہے!

غور کیجیے تو انسان کے افکار و اعمال کی دنیا کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں صرف موسم کے درخت ہی نہیں اُگتے، موسم کے دماغ بھی اُگا کرتے ہیں۔ اور پھر جس طرح یہاں کا ہر فضائی موسم اپنے مزاج کی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے، اور اسی کے مطابق اس کی تمام پیداوار ظہور میں آتی رہتی ہیں، اسی طرح وقت کا ہر دماغی موسم بھی اپنا ایک خاص معنوی مزاج رکھتا ہے، اور ضروری ہے کہ اسی کے مطابق طبیعتیں اور ذہنیتیں ظہور میں آئیں لیکن چونکہ یہاں فطرت کی یکسانیوں اور ہم آہنگیوں کی طرح اُس کی گاہ گاہ کی ناہمواریاں بھی ہوئیں، اور یہاں کا کوئی قانون اپنے فلتات اور شواذ سے خالی نہیں، اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ ناوقت کے پھلوں کی طرح ناوقت کی طبیعتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اسے کارخانۂ نشوونما کے کاروبار کا نقص کہیے، یا زمانہ کی غلط اندیشی وقت (Anachronism) لیکن بہرحال ایسا ہوتا ضرور ہے۔ ایسی ناوقت کی طبیعتیں جب کبھی ظہور

میں آئینگی تو ناوقت کے پھلوں کی طرح موسم کے لیے اجنبی ہونگی۔ نہ تو وہ وقت کا ساتھ دے سکینگی۔ نہ وقت ان کے ساتھ میل کھا سکیگا۔ تاہم چونکہ اُن کی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہوتی ہے، اس لیے ناوقت کی چیز ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتیں۔ لوگوں کو مزہ ملے یا نہ ملے لیکن ان کی گراں قیمتی کا اعتراف ضرور کرینگے۔ صدرالدین شیرازی کے دقتِ تخیل نے اسی صورتِ حال کا سُراغ لگایا، اور دو مصرعوں میں ایک بڑی کہانی سُنا دی

یہ شعر دہراتے ہوئے مجھے خیال ہوا، میرا اور زمانہ کا باہمی معاملہ بھی شاید کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہوا۔ طبیعت کی بے میل اُفتادِ فکر و عمل کے کسی گوشہ میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے چل نہ سکی۔ اسے وجود کا نقص کہیے، لیکن یہ ایک ایسا نقص تھا جو اوّل روز سے طبیعت اپنے ساتھ لائی تھی اور اس لیے وقت کی کوئی خارجی تاثیر اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ زمانہ جو قدرتی طور موسمی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے، اس ناوقت کے پھل میں کیا لذت پا سکتا تھا؟ لوگ کھاتے ہیں تو مزہ نہیں ملتا۔ تاہم اس بے مزگی پر بھی اپنی قیمت ہمیشہ گراں ہی رہی۔ لوگ جانتے ہیں کہ مزہ ملے نہ ملے، مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی:

متاعِ من کہ نصیبش مبا دارزانی!

بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے، اور چونکہ مانگ ہوتی ہے۔ اس لیے ہر ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اسے قبول

کرتی ہے۔ مگر میرا معاملہ اس سے بالکل اُلٹا رہا۔ جس جنس کی بھی عام مانگ ہوئی میری دُکان میں جگہ نہ پا سکی۔ لوگ زمانہ کے روزبازار میں۔ ایسی چیزیں ڈھونڈھ کر لائینگے جن کا عام رواج ہو میں نے ہمیشہ ایسی جنس ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کی جس کا کہیں رواج نہ ہو۔ اَوروں کے لیے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی، وہی میرے لیے ترک و اعراض کی علت بن گئی۔ اُنھوں نے دُکانوں میں ایسا سامان سجایا جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں:

قماش دست زدِ شہر دِہ زمن مطلب
متاعِ من ہمہ دریائی ست یا کانی!

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دُکان لگائی، تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر ہو سکے:

در کوئے ما شکستہ دلی می خرند و بس
بازارِ خود فروشی ازاں سوئے دیگرست!

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا:

بارفیقانِ زخود رفتہ سفر دست نہ داد -

سیرِ صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم!

جس راہ میں بھی قدم اُٹھایا، وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مُڑ کے دیکھا، تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اُڑائی ہوئی تھی:

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگزارم

با آبلہ پایاں چہ کنم! قافلہ تیز ست!

اس تیز رفتاری سے تلوؤں میں چھالے پڑ گئے لیکن عجب نہیں، راہ کے کچھ خس وخاشاک صاف بھی ہو گئے ہوں:

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت

منتے بر قدمِ راہروانِ ست مرا!

اب اس وقت رشتۂ فکر کی گرہ کھل گئی ہے، تو یہ توقع نہ رکھیے کہ اسے جلد لپیٹ سکونگا:

کوتہ نتواں کرد کہ ایں قصہ دراز ست!

زندگی میں بہت سے حالات ایسے پیش آئے جو عام حالات میں کم پیش آتے ہیں۔ لیکن معاملہ کا ایک پہلو ایسا ہے جو ہمیشہ میرے لیے ایک معمہ رہا اور شاید دوسروں کے لیے بھی رہے۔ انسان اپنی ساری باتوں میں حالات

کی مخلوق اور گرد و پیش کے موثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ موثرات اکثر صورتوں میں آشکارا ہوتے ہیں اور سطح پر سے دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں مخفی ہوتے ہیں انہیں تہہ میں اُتر کر ڈھونڈھنا پڑتا ہے، تاہم سراغ ہر حال میں مل جاتا ہے نسل، خاندان، صحبت، تعلیم و تربیت، ان موثرات کے عنصری سرچشمے ہیں:

عن المرء لا تسئل؛ وسل عن قرینہ

لیکن اس اعتبار سے اپنی زندگی کے ابتدائی حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو بڑی حیرانی میں پڑ جاتا ہوں۔ فکر و طبیعت کی کتنی ہی بنیادی تبدیلیاں ہیں جن کا کوئی خارجی سرچشمہ دکھائی نہیں دیتا اور جو گرد و پیش کے تمام موثرات سے کسی طرح بھی جوڑے نہیں جا سکتے۔ کتنی ہی باتیں ہیں جو حالات و موثرات کے خلاف ظہور میں آئیں۔ کتنی ہی ہیں کہ ان کا ظہور سرتاسر متضاد شکلوں میں ہوا۔ دونوں صورتوں میں معاملہ ایک عجیب افسانہ سے کم نہیں:

فریاد حافظ ایں ہمہ آخر بہ ہرزہ نیست

ہم قصۂ عجیب و حدیثے غریب ہست!

جہاں تک طبیعت کی سیرت اور عادات و خصائل کا تعلق ہے میں اپنی خاندانی اور نسلی وراثت سے بے خبر نہیں ہوں۔ ہر انسان کی اخلاقی اور معاشرتی صورت کا قالب نسل و خاندان کی مٹی سے بنتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ میری عادات و خصائل کی مورتی بھی اسی مٹی سے بنی۔ ہر خاندان اپنی روایتی زندگی

کی ایک انفرادیت پیدا کرلیتا ہے، اور وہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں صاف محسوس کرتا ہوں کہ اس روایتی زندگی کے اثرات میرے خمیر میں رچ گئے ہیں اور میں ان کی پکڑ سے باہر نہیں جا سکتا۔ میری عادات و خصائل، چال ڈھال، طور طریقہ، امیال و اذواق، سب کے اندر خاندان کا ہاتھ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یہ خاندانی زندگی کی روایتیں مجھے میرے ددھیال اور ننھیال، دونوں سلسلوں سے ملیں، اور دونوں پر صدیوں کی قدامت اور تسلسل کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بہرحال میرے حصے میں آئی تھیں۔ ان کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں میری خواہش اور پسند کو کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن یہاں سوال عادات و خصائل کا نہیں ہے۔ افکار و عقائد کا ہے، اور جب اس اعتبار سے اپنی حالت کا جائزہ لیتا ہوں، تو خاندان، تعلیم، ابتدائی گرد و پیش، کوئی گوشہ بھی میل کھاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ فکری موثرات کے جتنے بھی احوال و ظروف (Environments) ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے لاتا ہوں اور اُن میں اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہوں۔ مگر مجھے اپنا سُراغ کہیں نہیں ملتا!

میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ متصلب اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی ادھر اُدھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے۔ میں نے

بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سُنیں، وہ بھی سر تا سر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور میرا دماغی ورثہ اِس تصلّب اور جمود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گردوپیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تک گزر ہی نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا، وہ بھی وہی تھے جنہیں والد مرحوم نے پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا کہ اُن کے معیارِ عقائد و فکر پر پورے اُتر سکتے ہیں، اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ اُن کے معاصروں میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہو سکتی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس دروازہ سے بھی کسی نئی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ جہاں تک زمانے کے فکری انقلابات کا تعلق ہے، میرے خاندان کی دنیا وقت کی راہوں سے اس درجہ دور واقع ہوئی تھی کہ اُن راہوں کی کوئی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی، اور اس اعتبار سے گویا سَو برس پہلے کے ہندوستان میں میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی صحبتوں کو انسانی دماغ کا سانچا ڈھالنے میں بہت دخل ہوتا ہے، لیکن میری سوسائٹی اوائلِ عمر میں گھر کی چار دیواری کے اندر محدود رہی، اور گھر کے عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ اگر کوئی دوسرا گروہ ملا بھی تو وہ خاندان کے معتقدوں اور مریدوں کا گروہ تھا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں چومتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے؛

یا رجعت قہقری کر کے پیچھے ہٹتے، اور دور مودب ہو کر بیٹھ رہتے۔ یہ فضا صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے کی جگہ اور زیادہ اُسے گہری کرتی رہتی۔ والد مرحوم کے مریدوں میں ایک بڑی تعداد علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی تھی۔ دیوان خانہ میں اکثر ان کا مجمع رہتا، مگر یہ پورا مجمع بھی سرتاسر اسی خاندانی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ کسی دوسرے رنگ کی وہاں جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

علاوہ بریں مرید اور معتقد جب کبھی مجھ سے ملتے تھے تو مجھے مرشد زادہ سمجھ کر منتظر رہتے تھے کہ مجھ سے کچھ سنیں۔ وہ مجھے کچھ سُنانے کی گستاخانہ جرأت کب کر سکتے تھے؟ انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا، لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ سے واسطہ پڑتا۔ مدرسہ کی تعلیمی زندگی بہر حال گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لیے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسہ یعنے مدرسۂ عالیہ کی تعلیم ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقۃ قابلِ وقعت تھی بھی نہیں، اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انہیں گوارا نہ تھا۔ انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں، یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے اُن سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے، گھر کی چار دیواری

سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلا شبہ اس کے بعد قدم کھلے اور ہندوستان سے باہر تک پہنچے لیکن یہ بعد کے واقعات ہیں جبکہ طالب علمی کا زمانہ بسر ہو چکا تھا اور میں نے اپنی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالی تھیں۔ میری عمر کا وہ زمانہ جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، چودہ پندرہ برس سے آگے نہیں بڑھا۔

پھر خود اُس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا؟ اس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے تو سفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور آپ کے لیے تفصیل ضروری نہیں۔ ایک ایسا فرسودہ نظامِ تعلیم جسے فنِ تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، سرتاسر عقیم ہو چکا ہے۔ طریقِ تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخابِ کتب کے اعتبار سے ناقص، درس و املار کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص۔ اگر فنونِ آلیہ کو الگ کر دیا جائے تو درس نظامیہ میں بنیادی موضوع دو ہی رہ جاتے ہیں۔ علوم دینیہ اور معقولات۔ علوم دینیہ کی تعلیم جن کتابوں کے درس میں منحصر رہ گئی ہے، اس سے اُن کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم حاصل ہو جاتا ہو، لیکن خود اُن علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے، اس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ تاریخ فلسفۂ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار ہے۔ حالانکہ علم کی دنیا اُس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی۔

فنونِ ریاضیہ جس قدر پڑھائے جاتے ہیں، وہ موجودہ عہد کی ریاضیات کے مقابلہ میں بمنزلہ صفر کے ہیں، اور وہ بھی عام طور پر نہیں پڑھائے جاتے میں نے اپنے شوق سے پڑھا تھا۔ جامع ازہر قاہرہ کے نصاب تعلیم کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ہندوستان میں متاخرین کی کتب معقولات کو فروغ ہوا۔ وہاں اتنی وسعت بھی پیدا نہ ہو سکی:۔

اے طبلِ بلند بانگ، در باطن ہیچ!

سید جمال الدین اسدآبادی نے جب مصر میں کتب حکمت کا درس دینا شروع کیا تھا، تو بڑی جستجو سے چند کتابیں وہاں مل سکی تھیں، اور علمائے ازہر اُن کتابوں کے ناموں سے بھی آشنا نہ تھے۔ بلاشبہ اب ازہر کا نظامِ تعلیم بہت کچھ اصلاح پا چکا ہے لیکن جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں، اُس وقت تک اصلاح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوئی تھی، اور شیخ محمد عبدہ مرحوم نے مایوس ہو کر ایک نئی سرکاری درسگاہ "دارالعلوم" کی بنیاد ڈالی تھی۔

فرض کیجیے میرے قدم اسی منزل میں رُک گئے ہوتے، اور علم و نظر کی جو راہیں آگے چل کر ڈھونڈھی گئیں، ان کی لگن پیدا نہ ہوئی ہوتی، تو میرا کیا حال ہوتا؟ ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد اور ناآشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

تعلیم کی جو رفتار عام طور پر رہا کرتی ہے، میرا معاملہ اس سے مختلف رہا مجھے اچھی

طرح یاد ہے کہ ۱۹۰۰ء میں جب میری عمر بارہ ۱۲ برس سے زیادہ نہ تھی، میں فارسی کی تعلیم سے فارغ اور عربی کی مبادیات سے گزر چکا تھا اور شرح مُلّا اور قطبی وغیرہ کے دور میں تھا۔ میرے ساتھیوں میں میرے مرحوم بھائی مجھ سے عمر میں دو ۲ برس بڑے تھے۔ باقی اور جتنے تھے، اُن کی عمریں بیس ۲۰ اکیس ۲۱ برس سے کم نہ ہونگی۔ والد مرحوم کا طریق تعلیم یہ تھا کہ ہر علم میں پہلے کوئی ایک مختصر متن حفظ کرلینا ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے خاندان کا طریق تعلیم ایسا ہی تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں میں نے فقہ اکبر، تہذیب، خلاصہ کیدانی وغیرہا برزبان حفظ کرلی تھیں، اور اپنے بروقت استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف طالب علموں کو بلکہ مولویوں کو بھی حیران کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے گیارہ بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بہت اُلجھتے تو میزان و منشعب کے سوالات کرتے۔ میں اُنہیں منطق کے قضیّوں اور اصول کی تعریفوں میں لیجا کر ہکّا بکّا کر دیتا۔ اس طریقہ کے فائدہ میں کلام نہیں۔ آج تک اُن متون کا ایک ایک لفظ حافظہ میں محفوظ ہے۔ خلاصہ کیدانی کی لوح کا شعر تک بھولا نہیں۔ کسی افغانی مُلّا نے "کے دانی" اور "کیدانی" کی تک بندی کی تھی:

توطریقِ صلوٰۃ کے دانی گر نہ خوانی خلاصۂ کیدانی

کتابوں کی درسی تحصیل کی مدت بھی عام رفتار سے بہت کم رہا کرتی تھی۔ اساتذ میری تیز رفتاریوں سے پہلے جھنجلاتے، پھر پریشان ہوتے، پھر مہربان ہو کر جرأت افزائی کرنے لگتے۔ جب کسی کتاب کا نیا دور شروع ہوتا تو باہر کے چند طلبا بھی

شریک ہو جاتے۔ لیکن ابھی چند دن بھی گزرنے نہ پاتے کہ میرا سبق دوسروں سے الگ ہو جاتا۔ کیونکہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ میرے معقولات کے ایک اُستاد لوگوں سے کہا کرتے تھے "یہ چھوٹے حضرت مجھے آج کل صدرا سُنایا کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجھ سے درس لیتے ہیں"

۱۹۰۳ء میں کہ عمر کا پندرھواں سال شروع ہوا تھا، میں درس نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور والد مرحوم کی ایما سے چند مزید کتابیں بھی نکال لی تھیں۔ چونکہ تعلیم کے باب میں قدیم خیال یہ تھا کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا نہ جائے، استعداد پختہ نہیں ہوتی، اس لیے فاتحۂ فراغ کی مجلس ہی میں طلبا کا ایک حلقہ میرے سپرد کر دیا گیا اور ان کے مصارفِ قیام کے والد مرحوم کفیل ہو گئے۔ میں نے تکمیلِ فنون کے لیے طب شروع کر دی تھی۔ خود قانون پڑھتا تھا اور طلبا کو مطوّل، میر زاہد اور ہدایہ وغیرہا کا درس دیتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا، اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے، اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے، جتنی سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ یہ چُبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم، اور گردو

پیش نے چُنی تھیں، بہ یک دفعہ متزلزل ہوگئیں، اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چُننی پڑیں

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم!

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اُس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اُسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ اُنہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ، جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے، اس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کریگا مگر اسے چھونے کی جرأت نہیں کریگا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دیگی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اُتریگی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہیگا۔

میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کشمکش پیدا ہوتی۔ وہ سر تا سر اُسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی جو موثرات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیے تھے، تعلیم نے اُنہیں اور زیادہ تیز کرنا چاہا اور گرد و پیش

نے اُنہیں اور زیادہ سہارے دیے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چُبھا، وہ اسی تقلید کے خلاف تھا؟ میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں، مگر بار بار یہی سوال سامنے اُبھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیے۔ تقلید اور توارُث پر کیوں ہو؟ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا۔ کیونکہ موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر اُستوار ہوتی ہو۔ جب بنیاد ہل گئی تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی؟ کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگیاں سہارے دیتی رہیں، لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا:

ازاں کہ پیروِ خلق گمرہی آرد

نمی رویم براہے کہ کارواں رفتست!

شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیلِ راہ بنی۔ بلا شُبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا، مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی، اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ گویا جس علت نے بیمار کیا تھا، وہی بالآخر دارُوئے شفا بھی ثابت ہوئی:

دردہا دادی، و درمانی ہنوز!

ہر چند سُراغ لگانا چاہتا ہوں کہ یہ کانٹا کہاں سے اُڑا تھا کہ تیر کی طرح دل میں

ترازو ہو گیا، مگر کوئی پتہ نہیں لگتا۔ کوئی تعلیل کام نہیں دیتی:

چہ مستی ست ندانم کہ رو بما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد!

بلا شبہ آگے چلکر کئی حالات ایسے پیش آئے جنہوں نے اس کانٹے کی چبھن اور زیادہ گہری کردی، لیکن اُس وقت تک تو کسی خارجی محرّک کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی، اور ہوش و آگہی کی عمر ہی نہ تھی کہ باہر کے موثرات کے لیے دل و دماغ کے دروازے کھل سکتے۔ یہ تو وہ حال ہوا کہ:

اتانی ھواھا، قبل ان اعرف الھویٰ
فصادف قلبا فارغا فتمکنا!

یہی زمانہ ہے جب پیرزادگی اور نسلی بزرگی کی زندگی بھی مجھے خود بخود چبھنے لگی اور معتقدوں اور مریدوں کی پرستاریوں سے طبیعت کو ایک گونہ توحش ہونے لگا۔ میں اس کی کوئی خاص وجہ اُس وقت محسوس نہیں کرتا تھا مگر طبیعت کا ایک قدرتی تقاضہ تھا جو ان باتوں کے خلاف لے جا رہا تھا:

بوئے آں دود کہ امسال بہ ہم سایہ رسید
ز آتشے بود کہ در خانۂ من پار گرفت!

سوال یہ ہے کہ تمام حالات اور موثرات کے خلاف طبیعت کی یہ افتاد کیونکر بنی اور کہاں سے آئی؟ خاندان عقائد و افکار کا جو سانچہ ڈھالنا چاہتا تھا، نہ

ڈھال سکا۔ تعلیم جس طرف لے جانا چاہتی تھی، نہ لے جا سکی۔ حلقۂ صحبت کے اثرات کا جو تقاضہ تھا، پورا نہ ہوا۔ اس عالمِ اسباب میں ہر حالت کا دامن کسی نہ کسی علت سے بندھا ہوتا ہے۔ آخر اس رشتہ کا بھی تو کوئی سرا ملنا چاہیے! واقعہ یہ ہے کہ نہیں ملتا۔ ممکن ہے یہ میری نظر کی کوتاہی ہو اور کوئی دوسری دقیقہ سنج نگاہ حالات کا مطالعہ کرے تو کوئی نہ کوئی محرک ڈھونڈھ نکالے، مگر مجھے تو تھک کر دوسری ہی طرف دیکھنا پڑا:

کارِ زلفِ تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند!

جس نامرادہستی کو چودہ پندرہ برس کی عمر میں زمانہ کی آغوش سے اس طرح چھین لیا گیا ہو، وہ اگر کچھ عرصہ کے لیے شاہراہِ عام سے گم ہو کر آوارۂ دشت وحشت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟ ایک عرصہ تک طرح طرح کی سرگردانیوں میں نشانِ راہ گم رہا۔ نہ مقصد کی خبر مل سکی۔ نہ منزل کی:

سگِ آستانم، اما ہمہ شب قلادہ خائم که سرِ شکار دارم نہ ہوائے پاسبانی
عجب ست گر نہ باشد خضرے بہ جستجویم کہ فتادہ ام بہ ظلمت چو زلال زندگانی

لیکن جس ہاتھ نے زمانہ کی آغوش سے کھینچا تھا، بالآخر اُسی نے دشت نوردیوں کی تمام بے راہ رویوں میں رہنمائی بھی کی، اور اگرچہ قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار ہونا پڑا، اور جیپہ جیپہ پر رکاوٹوں سے اُلجھنا پڑا، مگر طلب ہمیشہ آگے ہی کی طرف

بڑھائے لے گئی، اور جستجو نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ درمیانی منزلوں میں رُک کر دم لیلے۔ بالآخر دم لیا تو اُس وقت لیا، جب منزلِ مقصود سامنے جلوہ گر تھی، اور اس کی گردِ راہ سے چشمِ تمنائی روشن ہو رہی تھی:

بہ وصلش تارسم، صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم!

چوبیس برس کی عمر میں جبکہ لوگ عشرتِ شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلوؤں کے کانٹے چُن رہا تھا:

در بیاباں گر بشوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں، غم مخور!

گویا اس معاملہ میں بھی اپنی چال زمانہ سے اُلٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے میں کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا:

کام تھے عشق میں بہت، پر میرؔ — ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

اُس وقت سے لے کر آج تک کہ کاروانِ بادرفتارِ عمر منزلِ خمسین سے بھی گزر چکا، فکر و عمل کے بہت سے میدان نمودار ہوئے اور اپنی راہ پیمائیوں کے نقوش جابجا بنانے پڑے۔ وقت یا تو اُنہیں مٹا دیگا جیسا کہ ہمیشہ مٹاتا رہا ہے۔ یا محفوظ رکھیگا جیسا کہ ہمیشہ محفوظ رکھتا آیا ہے:

آئینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست — تصویرِ خود بلوحِ دگر می کشیم ما!

یہاں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے تھے جنہیں ابوطالب کلیم نے دو مصرعوں میں بتلا دیا ہے:

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت!

پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا تھا۔ ناچار دوسرا اختیار کرنا پڑا:

کارِ مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم:

جو نامراد یہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہ نہ تو راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے ناآشنا ہوتے ہیں نہ اپنی ناتوانیوں اور درماندگیوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ تاہم وہ قدم اُٹھا دیتے ہیں۔ کیونکہ قدم اُٹھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ زمانہ اپنی ساری ناموافقتوں اور بے امتیازیوں کے ساتھ بار بار اُن کے سامنے آتا ہے، اور طبیعت کی خلقی درماندگیاں قدم قدم پر دامنِ عزم و ہمت سے اُلجھنا چاہتی ہیں، تاہم اُن کا سفر جاری رہتا ہے۔ وہ زمانہ کے پیچھے نہیں چل سکتے تھے، لیکن زمانہ کے اوپر سے گزر جا سکتے تھے، اور بالآخر بے نیازانہ گزر جاتے ہیں:

وقتِ عرفیؔ خوش، کہ نہ کشودند گر در بر رُخش

بر درِ نکشودہ ساکن شد، درِ دیگر نہ زد!

اب صبحِ عید نے اپنے چہرہ سے صبحِ صادق کا ہلکا نقاب بھی اُلٹ دیا ہے

اور بے حجابانہ مُسکرا رہی ہے:

اِک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا!

میں اب آپ کو اور زیادہ اپنی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش نہیں کرونگا۔ کیونکہ صبحِ عید کی اس جلوہ نمائی کا آپ کو جواب دینا ہے۔ کئی سال ہوئے، ایک مکتوبِ گرامی میں شبہائے رمضان کی "عنبریں چائے" کا ذکر آیا تھا۔ بے محل نہ ہوگا اگر اُس کے جرعہ ہائے پیہم سے قبلِ صلوٰۃِ عید افطار کیجیے کہ عید الفطر میں تعجیل مسنون ہوئی اور عید اضحیٰ میں تاخیر:

عید ست، و نشاط و طرب و زمزمہ عام ست
مے نوش، گنہ بر من اگر بادہ حرام ست!
از روزہ اگر کوفتہ، بادہ دوا گیر
ایں مسئلہ حل گشت ز ساقی کہ امام ست!

ابوالکلام

قلعۂ احمد نگر

۱۷۔ اکتوبر ۴۲ء

از بہر چہ گویم "ہست" از خود خبرم چوں نیست
وز بہر چہ گویم "نیست" با او نظرے چوں ہست!

صدیق مکرم صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ اس وقت لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی ختم ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ سیاہی کی شیشی خالی ہو چکی تھی۔ نئی شیشی منگوانی تھی مگر منگوانا بھول گیا۔ میں نے سوچا، تھوڑا سا پانی کیوں نہ ڈال دوں؟ یکایک چائدانی پر نظر پڑی۔ میں نے تھوڑی سی چائے فنجان میں اونڈیلی اور قلم کا مُنہ اُس میں ڈبو کر پچکاری چلا دی۔ پھر اُسے اچھی طرح ہلا دیا کہ روشنائی کی دھووَن پوری طرح نکل آئے۔ اور اب دیکھیے روشنائی کی جگہ چائے کے تند و گرم عرق سے اپنے نفسہائے سرد صفحۂ قرطاس پر نقش کر رہا ہوں:

می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما جوشِ آتش بود امروز بہ فوّارۂ ما!

طبیعت افسردہ ہوتی ہے تو الفاظ بھی افسردہ نکلتے ہیں۔ میں طبیعت کی افسردگیوں کا چائے کے گرم جاموں سے علاج کیا کرتا ہوں۔ آج قلم کو بھی ایک گھونٹ پلا دیا:

ایں کہ در جام و سبو دارم مہیّا، آتش ست

آپ اس طریقِ کار پر متعجب نہ ہوں۔ آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے فیضی کو بھی یہی طریقہ کام میں لانا پڑا تھا۔ نل دمن میں اُس نے ہمیں خبر دی ہے:

تا تازہ و تر زنم رستم را در بادہ کشیدہ ام تسلم را!

آج بھی جام وہی ہے جو روز گردش میں آتا ہے، لیکن جام میں جو کچھ اونڈیل رہا ہوں، اُس کی کیفیتیں کچھ بدلی ہوئی پائیگا:

از مئے دوشیں قدرے تند تر!

بارہا مجھے خیال ہوا کہ ہم خدا کی ہستی کا اقرار کرنے پر اس لیے بھی مجبور ہیں کہ اگر نہ کریں تو کارخانۂ ہستی کے معمے کا کوئی حل باقی نہیں رہتا، اور ہمارے اندر ایک حل کی طلب ہے جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے:

آں کہ ایں نامۂ سربستہ نوشتہ است نخست

گرہے سخت بہ سر رشتۂ مضموں زدہ است!

اگر ایک اُلجھا ہوا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں اُس کے حل کی جستجو ہوتی ہے، تو ہم کیا کرتے ہیں؟ ہمارے اندر بالطبع یہ بات موجود ہے اور منطق اور ریاضی نے اُسے راہ پر لگایا ہے کہ ہم اُلجھاؤ پر غور کرینگے۔ ہر اُلجھاؤ اپنے حل کے لیے ایک خاص طرح کے تقاضے کا جواب چاہتا ہے۔ ہم کوشش کرینگے کہ ایک کے بعد ایک، طرح طرح کے حل سامنے لائیں اور دیکھیں اس تقاضہ کا جواب ملتا ہے یا نہیں؟ پھر جونہی ایک حل ایسا نکل آئیگا جو اُلجھاؤ کے سارے تقاضوں

کا جواب دیدیگا اور معاملہ کی ساری کلیں ٹھیک ٹھیک بیٹھ جائینگی۔ ہمیں پورا یقین ہو جائیگا کہ اُلجھاؤ کا صحیح حل نکل آیا۔ اور صورتِ حال کی یہ اندرونی شہادت ہمیں اس درجہ مطمئن کر دیگی کہ پھر کسی بیرونی شہادت کی احتیاج باقی ہی نہیں رہیگی۔ اب کوئی ہزار شبہے نکالے، ہمارا یقین متزلزل ہونے والا نہیں۔

فرض کیجیے، کپڑے کے ایک تھان کا ایک ٹکڑا کسی نے پھاڑ لیا ہو اور ٹکڑا پھٹا ہو اس طرح ٹیڑھا ترچھا اور دندانہ دار ہو کر، کہ جب تک ویسے ہی اُلجھاؤ کا ایک ٹکڑا وہاں آکر بیٹھتا نہیں، تھان کی خالی جگہ بھرتی نہیں۔ اب اُسی کپڑے کے بہت سے ٹکڑے ہمیں مل جاتے ہیں اور ہر ٹکڑا وہاں بٹھا کر ہم دیکھتے ہیں کہ اس خلا کی نوعیت کا تقاضہ پورا ہوتا ہے یا نہیں مگر کوئی ٹکڑا ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اگر ایک گوشہ میل کھاتا ہے تو دوسرے گوشے جڑنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکڑا ایسا نکل آتا ہے کہ ٹیڑھے ترچھے کٹاؤ کے سارے تقاضے پورے کر دیتا ہے، اور صاف نظر آجاتا ہے کہ صرف اسی ٹکڑے سے یہ خلا بھرا جا سکتا ہے۔ اب اگرچہ اُس کی تائید میں کوئی خارجی شہادت موجود نہ ہو، لیکن ہمیں پورا یقین ہو جائیگا کہ یہی ٹکڑا یہاں سے پھاڑا گیا تھا، اور اس درجہ کا یقین ہو جائیگا کہ "لو کشف الغطاء لما ازددت یقینا!"

اس مثال سے ایک قدم اور آگے بڑھائیے، اور گورکھ دھندے کی مثال سامنے لائیے۔ بے شمار طریقوں سے ہم اُسے مرتب کرنا چاہتے ہیں مگر ہوتا نہیں۔ بالآخر ایک خاص ترتیب ایسی نکل آتی ہے کہ اُس کے ہر جزء کا تقاضہ پورا ہو جاتا

ہے، اور اُس کی چوُل ٹھیک ٹھیک بیٹھ جاتی ہے۔ اب گو کوئی خارجی دلیل اس ترتیب کی صحت کی موجود نہ ہو، لیکن یہ بات کہ صرف اسی ایک ترتیب سے اُس کا اُلجھاؤ دور ہو سکتا ہے، بجائے خود ایک ایسی فیصلہ کن دلیل بن جائیگی کہ پھر ہمیں کسی اَور دلیل کی احتیاج باقی ہی نہیں رہیگی۔ اُلجھاؤ کا دور ہو جانا اور ایک نقش کا نقش بن جانا بجائے خود ہزاروں دلیلوں کی ایک دلیل ہے!

اب علم و یقین کی راہ میں ایک قدم اَور آگے بڑھائیے، اور ایک تیسری مثال سامنے لائیے۔ آپ نے حرفوں کی ترتیب سے کھلنے والے قفل دیکھے ہونگے۔ انہیں پہلے قفلِ ابجد کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک خاص لفظ کے بننے سے وہ کھُلتا ہے اور وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اب ہم طرح طرح کے الفاظ بناتے جائینگے اور دیکھینگے کہ کھُلتا ہے یا نہیں؟ فرض کیجیے، ایک خاص لفظ کے بنتے ہی کھُل گیا۔ اب کیا ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو جائیگا کہ اسی لفظ میں اس قفل کی کنجی پوشیدہ تھی؟ جستجو جس حل کی تھی، وہ قفل کا کھلنا تھا۔ جب ایک لفظ نے قفل کھول دیا تو پھر اس کے بعد باقی کیا رہا جس کی مزید جستجو ہو؟

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر اس طلسمِ ہستی کے معمّے پر غور کیجیے جو خود ہمارے اندر اور ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمّہ کا حل ڈھونڈھ رہا ہے لیکن اس پُرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق کچھ اس طرح کھویا گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم

ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی۔ نہ اسی کا کچھ سُراغ ملتا ہے کہ ختم کہاں جا کر ہوگی اور کیونکر ہوگی؟

اوّل و آخرِ ایں کہنہ کتاب اُفتادست!

زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جا کر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے؟ یہ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ "انسان کیا ہے؟" تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے؟ اور پھر حیرت اور درماندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟

مُردم در انتظار و دریں پردہ راہ نیست

یا ہست، و پردہ دار نشانم نہ می دہد!

اُس وقت سے لے کر جبکہ ابتدائی عہد کا انسان پہاڑوں کے غاروں سے سر نکال کر سُورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتا تھا، آج تک، جبکہ وہ علم کی تجربہ گاہوں سے سر نکال کر فطرت کے بے شمار چہرے بے نقاب دیکھ رہا ہے، انسان کے فکر و عمل کی ہزاروں باتیں بدل گئیں مگر یہ معمّہ معمّہ ہی رہا:

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من دیں حرفِ معمّہ نہ تو خوانی و نہ من!

ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو چوں پردہ برافتد، نہ تو مانی و نہ من!

ہم اس اُلجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سُلجھانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں، وہ اور زیادہ اُلجھتا جاتا ہے۔ ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے، اُسے ہٹانے

میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں، لیکن جب وہ ہٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے، سو پردے اور اُس کے پیچھے پڑے تھے، اور جو پردہ ہٹا تھا، وہ فی الحقیقت پردے کا ہٹنا نہ تھا بلکہ نئے نئے پردوں کا نکل آنا تھا۔ ایک سوال کا جواب ابھی حل نہیں چکتا کہ دس نئے سوال سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک راز ابھی حل نہیں ہو چکتا کہ سو نئے راز چشمک کرنے لگتے ہیں؛

دریں میدانِ پُر نیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی و صد کشور تماشائی!

انسٹائن (Einstein) نے اپنی ایک کتاب[1] میں سائنس کی جستجوئے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز کی سراغ رسانیوں سے تشبیہ دی ہے، اور اس میں شک نہیں کہ نہایت معنی خیز تشبیہ دی ہے۔ علم کی یہ سراغ رسانی فطرت کی غیر معلوم گہرائیوں کا کھوج لگانا چاہتی تھی، مگر قدم قدم پر نئے نئے مرحلوں اور نئی نئی دشواریوں سے دوچار ہوتی رہی۔ ذی مقراطیس (Democritus) کے زمانہ سے کہ جس نے چار سو برس قبل مسیح مادہ کے سالمات (Atoms) کی نقش آرائی کی تھی، آج تک، جبکہ نظریۂ مقادیرِ عنصری (Quantum Theory) کی رہنمائی میں ہم سالمات کا ازسرِ نو تعاقب کر رہے ہیں، علم کی ساری کد و کاوش کا نتیجہ اس کے سوا

[1] "دی ایولیوشن آف فزکس" جس کی ترتیب میں لیوپولڈ انفلیڈ بھی شریک تھا۔

کچھ نہ نکلا کہ پچھلی گتھیاں سلجھی گئیں، نئی نئی گتھیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اس ڈھائی ہزار برس کی مسافرت میں ہم نے بہت سی نئی منزلوں کا سُراغ پالیا جو اثناء سفر میں نمودار ہوتی رہیں، لیکن حقیقت کی وہ آخری منزلِ مقصود جس کے سُراغ میں علم کا مسافر نکلا تھا، آج بھی اُسی طرح غیر معلوم ہے، جس طرح ڈھائی ہزار برس پہلے تھی۔ ہم جس قدر اُس سے قریب ہونا چاہتے ہیں، اُتنا ہی وہ دور ہوتی جاتی ہے:

با من آویزشِ او الفت موج ست و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من!

دوسری طرف ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک نہ بجھنے والی پیاس کھول رہی ہے جو اس معمۂ ہستی کا کوئی حل چاہتی ہے۔ ہم کتنا ہی اُسے دبانا چاہیں مگر اُس کی تپش لبوں پر آہی جائیگی۔ ہم بغیر ایک حل کے سکونِ قلب نہیں پا سکتے۔ بسا اوقات ہم اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ کسی تشفی بخش حل کی ہمیں ضرورت نہیں، لیکن یہ محض ایک بناوٹی تخیل ہوتا ہے، اور جونہی زندگی کے قدرتی تقاضوں سے ٹکراتا ہے، پاش پاش ہو کر رہ جاتا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے مفکّروں کے تازہ ترین آثر کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے، موجودہ جنگ نے اُن تمام دماغوں میں جو کل تک اپنے آپ کو مطمئن تصوّر کرنے کی کوشش کرتے تھے، کیسا تہلکہ مچا رکھا ہے؛ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ

پروفیسر جود (Joad) کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اُن تمام فیصلوں پر جو ہم نے مذہب اور خدا کی ہستی کے بارے میں کیے تھے، اب از سر نو غور کرنا چاہیے۔ یہ پروفیسر جود بعد از جنگ کا اعلان ہے۔ لیکن پروفیسر جود قبل از جنگ کے اعلانات کس درجہ اس سے مختلف تھے؟ برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) نے بھی گزشتہ سال ایک مطوّل مقالہ میں جو بعض امریکی رسائل میں شائع ہوا، ایسی ہی رائے ظاہر کی تھی۔

مگر جس وقت یہ معمہ انسانی دماغ کے سامنے نیا نیا اُبھرا تھا، اُسی وقت اس کا حل بھی اُبھر آیا تھا۔ ہم اُس حل کی جگہ دوسرا حل ڈھونڈھنا چاہتے ہیں، اور یہیں سے ہماری تمام بے حاصلیاں سر اُٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔

اچھا، اب غور کیجیے، اس معمہ کے حل کی کاوش بالآخر ہمیں کہاں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے؟ یہ پورا کارخانۂ ہستی اپنے ہر گوشہ اور اپنی ہر نمود میں سرتاسر ایک سوال ہے۔ سورج سے لے کر اُس کی روشنی کے ذروں تک، کوئی نہیں جو یک قلم پرسش و تقاضہ نہ ہو۔ "یہ سب کچھ کیا ہے؟" "یہ سب کچھ کیوں ہے؟" "یہ سب کچھ کس لیے ہے؟" ہم عقل کا سہارا لیتے ہیں، اور اس روشنی میں جسے ہم نے علم کے نام سے پکارا ہے، جہاں تک راہ ملتی ہے چلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی حل نہیں ملتا جو اس الجھاؤ کے تقاضوں کی پیاس بجھا سکے۔ روشنی گُل ہو جاتی ہے، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں، اور عقل و ادراک کے سارے

سہارے جواب دیدیتے ہیں۔ لیکن پھر جونہی ہم پُرانے حل کی طرف لوٹتے ہیں، اور اپنی معلومات میں صرف اتنی بات بڑھا دیتے ہیں کہ "ایک صاحب ادراک و ارادہ قوت پس پردہ موجود ہے" تو اچانک صورتِ حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے، اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے، جیسے اندھیرے سے نکل یکایک اُجالے میں آ کھڑے ہوئے۔ اب جس طرف بھی دیکھتے ہیں، روشنی ہی روشنی ہے۔ ہر سوال نے اپنا جواب پالیا، ہر تقاضے کی طلب پوری ہو گئی، ہر پیاس کو سیرابی مل گئی۔ گویا یہ سارا اُلجھاؤ ایک قفل تھا جو اس کنجی کے چھوتے ہی کھل گیا:

چندانکہ دست و پا زدم، آشفتہ تر شدم
ساکن شدم، میانۂ دریا کنار شد!

اگر ایک ذی عقل ارادہ پسِ پردہ موجود ہے، تو یہاں جو کچھ ہے، کسی ارادہ کا نتیجہ ہے، اور کسی معیّن اور رطے شدہ مقصد کے لیے ہے۔ جونہی یہ حل سامنے رکھ کر ہم اس گورکھ دھندے کو ترتیب دیتے ہیں، معاً اس کی ہر کج پیچ نکل جاتی ہے اور ساری چولیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ "کیونکہ ہر کیا ہے؟" اور "کیوں ہے؟" کو ایک معنیٰ خیز جواب مل جاتا ہے۔ گویا اس معمہ کے حل کی ساری رُوح ان چند لفظوں کے اندر سمٹی ہوئی تھی۔ جونہی یہ سامنے آئے معمہ معمہ نہ رہا، ایک معنیٰ خیز داستان بن گیا۔ پھر جونہی یہ الفاظ سامنے سے ہٹنے لگتے ہیں، تمام معانی واشارات غائب ہو جاتے ہیں، اور ایک خنک اور بیجان

چیستاں باقی رہ جاتی ہے۔

اگر جسم میں روح بولتی ہے، اور لفظ میں معنی اُبھرتا ہے، تو حقائق ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روحِ معنی رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ معمۂ ہستی کے بے جان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے روحِ معنی پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم کر لیں۔

اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اگر ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے، تو پھر جو کچھ بھی ہے، روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے۔ ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں، اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے۔

فطرت کائنات میں ایک مکمل مثال (Pattern) کی نمود داری ہے۔ ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور جمالی (Aesthetic) بھی۔ اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے۔ اُس کا جمال ہم میں محویت پیدا کرتا ہے۔ پھر کیا ہم فرض کر لیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی مُدرک (Intelligent) قوت کے کام کر رہی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ فرض کر لیں مگر نہیں کر سکتے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایسا فرض کر لینا ہماری دماغی خودکشی ہوگی۔

اگر غور کیجیے، تو اس حل پر یقین کرتے ہوئے ہم اسی طریقِ نظر سے کام

لینا چاہتے ہیں جو ریاضیات کے اعدادی اور پیمائشی حقائق سے ہمارے دماغوں میں کام کرتا رہتا ہے۔ ہم کسی عددی اور پیمائشی اُلجھاؤ کا حل صرف اُسی حل کو تسلیم کرینگے جس کے ملتے ہی اُلجھاؤ دور ہو جائے۔ اُلجھاؤ کا دور ہو جانا ہی حل کی صحت کی اٹل دلیل ہوتی ہے۔ بلاشبہ دونوں صورتوں میں اپنے اُلجھاؤ اور حل کی نوعیت ایک طرح کی نہیں ہوتی۔ اعدادی مسائل میں اُلجھاؤ عددی ہوتا ہے۔ یہاں عقلی ہے۔ وہاں عددی حل عددی حقائق کا یقین پیدا کرتا ہے یہاں عقلی حل عقلی اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ تاہم طریق نظر کا سانچا دونوں جگہ ایک ہی طرح کا ہوا۔ دونوں راہیں ایک ہی طرح کھلتی اور ایک ہی طرح بند ہوتی ہیں۔

اگر کہا جائے، حل کی طلب ہم اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ اپنے محسوسات وتعقل کے محدود دائرے میں اس کے عادی ہو گئے ہیں، اور اگر اس حل کے سوا اور کسی حل سے ہمیں تشفی نہیں ملتی تو یہ بھی اسی لیے ہے کہ ہم حقیقت تولنے کے لیے اپنے محسوسات ہی کا ترازو ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں، تو اس کا جواب بھی صاف ہے۔ ہم اپنے آپ کو اپنے فکر و نظر کے دائرے سے باہر نہیں لے جاسکتے۔ ہم مجبور ہیں کہ اسی کے اندر رہ کر سوچیں اور حکم لگائیں، اور یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ "ہم مجبور ہیں، کہ سوچیں اور حکم لگائیں" تو:

این سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من ست!

مسئلہ کا ایک اَور پہلو بھی ہے جو اگر غور کریں تو فوراً ہمارے سامنے نمایاں ہو جائیگا۔ انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہنچ کر نشوو ارتقا کی تمام پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں، اور بلندی کے ایک ایسے ارفع مقام پر پہنچ گیا ہے جو اسے کرۂ ارضی کی تمام مخلوقات سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اُسے اپنی لامحدود ترقیوں کے لیے ایک لامحدود بلندی کا نصب العین چاہیے جو اسے برابر اوپر ہی کی طرف کھینچتا رہے۔ اس کے اندر بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کی طلب ہمیشہ اُبلتی رہتی ہے اور وہ اونچی سے اونچی بلندی تک اُڑ کر بھی رُکنا نہیں چاہتی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ اوپر ہی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑیگا کہ خدا کی ہستی کے سوا اَور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہستی اُس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہیگا۔

کرۂ ارضی کی موجودات میں جتنی چیزیں ہیں، سب انسان سے نچلے درجے کی ہیں۔ وہ ان کی طرف نظر نہیں اُٹھا سکتا۔ اس کے اوپر اجرام سماوی کی موجودات پھیلی ہوئی ہیں، لیکن ان میں بھی کوئی ہستی ایسی نہیں جو اس کے لیے نصب العین بن سکے۔ وہ سورج کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا۔ وہ چمکتے ہوئے ستاروں سے عشق نہیں کر سکتا۔ سورج اُس کے جسم کو گرمی

بخشتا ہے، لیکن اس کی مخفی قوتوں کی اُمنگوں کو گرم نہیں کرسکتا۔ ستارے اُس کی اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں لیکن اُس کے دل و دماغ کے نہانخانہ کو روشن نہیں کرسکتے۔ پھر وہ کونسی ہستی ہے جس کی طرف وہ اپنی بلند پروازیوں کے لیے نظر اُٹھا سکتا ہے؟

یہاں اُس کے چاروں طرف پستیاں ہی پستیاں ہیں جو اسے انسانیت کی بلندی سے پھر حیوانیت کی پستیوں کی طرف لیجانا چاہتی ہیں، حالانکہ وہ اوپر کی طرف اُڑنا چاہتا ہے۔ وہ عناصر کے درجہ سے بلند ہو کر نباتاتی زندگی کے درجہ میں آیا۔ نباتات سے بلند تر ہو کر حیوانی زندگی کے درجہ میں پہنچا۔ پھر حیوانی مرتبہ سے اُڑ کر انسانیت کی شاخِ بلند پر اپنا آشیانہ بنایا۔ اب وہ اس بلندی سے پھر نیچے کی طرف نہیں دیکھ سکتا، اگرچہ حیوانیت کی پستی اسے برابر نیچے ہی کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ وہ فضا کی لاانتہا بلندیوں کی طرف آنکھ اُٹھاتا ہے:

نہ باندازۂ بازوست کمندم ہیہات
ورنہ باگوشۂ بامیم سروکارے ہست!

اُسے بلندیوں، لامحدود بلندیوں کا ایک بامِ رفعت چاہیے جس کی طرف وہ برابر دیکھتا رہے اور جو اسے ہر دم بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کا اشارہ کرتا رہے:

ترا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ اُفتادست!

اسی حقیقت کو ایک جرمن فلسفی رے ہل (Riehl) نے ان لفظوں میں ادا کیا تھا "انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا جب تک کوئی ایسی چیز اُس کے سامنے نہ ہو جو خود اس سے بلند تر ہے۔ وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لیے سر اوپر کر سکتا ہے!"

بلندی کا یہ نصب العین خدا کی ہستی کے تصور کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بلندی اُس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اُسے نیچے کی طرف دیکھنے کے لیے جھکنا پڑیگا۔ اور جونہی اس نے نیچے کی طرف دیکھا، انسانیت کی بلندی پستی میں گرنے لگی!

یہی صورتِ حال ہے جو ہمیں یقین دلاتی ہے کہ خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب ہے، اور چونکہ فطری تقاضے کا جواب ہے، اس لیے اس کی جگہ انسان کے اندر پہلے سے موجود ہونی چاہیے۔ بعد کی بنائی ہوئی بات نہیں ہو سکتی۔

زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کے فطری تقاضے ہیں۔ فطرت نے فطری تقاضوں کے فطری جواب دیے ہیں اور دونوں کا دامن اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا ہے کہ اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، دونوں میں سے کون

پہلے ظہور میں آیا تھا؟ تقاضے پہلے پیدا ہوئے تھے، یا اُن کے جوابوں نے پہلے سر اُٹھایا تھا؟ چنانچہ جب کبھی ہم کوئی فطری تقاضہ محسوس کرتے ہیں، تو ہمیں پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ اس کا فطری جواب بھی ضرور موجود ہوگا۔ اس حقیقت میں ہمیں کبھی شبہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے بچّہ کی دماغی نشو و نما اور اُس کی قوتِ محاکات کے اُبھرنے کے لیے مثالوں اور نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مثالوں اور نمونوں کے بغیر اپنی فطری قوتوں کو ان کی اصلی چال نہیں چلا سکتا۔ حتیٰ کہ بات کرنا بھی نہیں سیکھ سکتا جو اُس کے مرتبۂ انسانیت کا امتیازی وصف ہے۔ اور چونکہ یہ اس کی ایک فطری طلب ہے، اس لیے ضروری تھا کہ خود فطرت ہی نے اول روز سے اس کا جواب بھی مہیا کر دیا ہوتا۔ چنانچہ یہ جواب پہلے ماں کی ہستی میں اُبھرتا ہے۔ پھر باپ کے نمونے میں سر اُٹھاتا ہے۔ پھر روز بروز اپنا دامن پھیلاتا جاتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ اِس صورتِ حال کا یقین کس طرح ہمارے دماغوں میں بسا ہوا ہے؟ ہم کبھی اس میں شک کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے دماغوں میں یہ سوال اُٹھتا ہی نہیں کہ بچے کے لیے والدین کا نمونہ ابتدا سے کام دیتا آیا ہے یا بعد کو انسانی بناوٹ نے پیدا کیا ہے؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک فطری مطالبہ ہے، اور فطرت کے تمام مطالبے جبھی سر اُٹھاتے ہیں، جب ان کے جواب کا

بھی سروسامان مہیا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی دماغ کی نشو و نما ایک خاص درجہ تک پہنچ کر اُن تمام نمونوں سے آگے بڑھ جاتی ہے جو اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، اور اپنے عروج و ارتقاء کی پرواز جاری رکھنے کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے، تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اُس کی ہستی کا ایک فطری مطالبہ ہے، اور اگر فطری مطالبہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کا فطری جواب بھی خود اس کی ہستی کے اندر ہی موجود ہو، اور اُس کے ہوش و خرد نے آنکھیں کھولتے ہی اسے اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ یہ جواب کیا ہو سکتا ہے؟ جس قدر جستجو کرتے ہیں، خدا کی ہستی کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لے کر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس تصوّر کی اُمنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بننا شروع ہوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی۔ اور حتّیوں (Hittites) اور عیلامیوں نے جب اپنے تعبدانہ تصورات کے نقش و نگار بنائے تھے، تو انسانی تمدن کی طفولیت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ مصریوں نے ولادتِ مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا، اور

کالڈیا کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کیے جو گزری ہوئی قوموں سے اُنھیں ورثہ میں ملے تھے:

در ہیچ پردہ نیست نہ باشد نوائے تو
عالم پُر است از تو و خالیست جائے تو

ابوالفضل نے عبادت گاہ کشمیر کے لیے کیا خوب کتبہ تجویز کیا تھا: "الٰہی، بہر خانہ کہ می نگرم جویائے تو اند، و بہر زباں کہ می شنوم گویائے تو":

اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ — خلقے بتو مشغول تو غائب زمیانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن کعبہ — یعنے کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ!

ابوالکلام

قلعۂ احمد نگر

۱۸ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم کل کا مکتوب کاغذ پر ختم ہو چکا تھا لیکن دماغ میں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت قلم اُٹھایا تو پھر خیالات اُسی رُخ پر بڑھنے لگے۔

غور و فکر کی یہی منزل ہے جو ہمیں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی متوجہ کر دیتی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ انسان خدا کے ماورائے تعقل اور غیر شخصی تصوّر پر قانع نہ رہ سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر و احساسات کے مطابق ایک "متشخص" تصوّر پیدا کرتا رہا؟ میں "متشخص" تصور یہاں اُس معنی میں بول رہا ہوں جس معنی میں "پرسنل گاڈ" (Personal God) کی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ متشخص تصور کے مختلف مدارج ہیں۔ ابتدائی درجہ تو تشخص محض کا ہوتا ہے جو صرف شخصیت کا اثبات کرتا ہے، لیکن پھر آگے چل کر یہ شخصیت خاص خاص صفتوں اور فعالیتوں کا جامہ پہن لیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جامہ ناگزیر کیوں ہوا؟ اس کی علت بھی یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک متشخص اور علائق نواز تصوّر کے بجھ نہیں سکتی حقیقت کچھ ہی ہو، لیکن یہ تصوّر جب کبھی اُس کے سامنے آئیگا تو تشخص کی ایک نقاب چہرہ پر ضرور ڈال لیگا

یہ نقاب کبھی بھاری رہی، کبھی ہلکی ہوگئی، کبھی ڈرانے والی رہی، کبھی لُبھانے والی بن گئی، لیکن چہرہ سے اُتری کبھی نہیں۔ اور یہیں سے ہمارے دیدۂ صورت پرست کی ساری درماندگیاں شروع ہوگئیں:

برچہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرمِ نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست!

دنیا میں وحدت الوجود (Pantheism) کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے۔ غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا، اور مذہب افلاطون جدید (Neoplatonism) نے (جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا) اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں۔ یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخصات سے منزہ کرکے یک کامل مطلق اور بحت تصور قائم کر دیتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہوسکتیں، اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات و مظاہر کے اعتبار سے۔ نہ کہ ذاتِ مطلق کی ہستی کے اعتبار سے۔ اس عقیدہ کا روشناس اُس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے کہ ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں تک کہ اشارہ بھی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو ذاتِ مطلق، مطلق نہیں رہتی، تشخص اور حدود کے غبار سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا تھا:

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نہ می تواں کہ اشارت باو کنند!

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اوپنیشدوں نے نفیِ صفات کی راہ اختیار کی اور تنزیہہ کی "نیتی نیتی" کو بہت دور تک لے گئے، لیکن پھر دیکھیے، اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذات مطلق) کو ایشور (ذات متصف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے بلکہ پتھر کی مورتیاں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے:

کرے کیا کعبہ میں جو سرِ بتخانہ سے آگہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے، واں اللہ ہی اللہ ہے!

یہودیوں نے خدا کو ایک قاہر و جابر شہنشاہ کی صورت میں دیکھا، اور اسرائیل کے گھرانے سے اُس کا رشتہ ایسا ہوا، جیسا ایک غیور شوہر کا اپنی بے حیا بیوی کے ساتھ ہوتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دیگا مگر اس کی بے وفائی کبھی معاف نہیں کریگا۔ کیونکہ اُس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اُس کی محبت کے ساتھ کسی دوسرے کی محبت بھی شریک ہو۔ اِنّ اللہ لا یغفر ان یشرک بہ، ویغفر مادون ذٰلک لمن یشاء۔ چنانچہ تورات کے احکامِ عشرہ میں ایک حکم یہ تھا۔ تو کسی چیز کی مورتی نہ بنائیو، نہ اُس کے آگے جھکیو۔ کیونکہ میں خداوند تیرا خدا ایک غیور خدا ہوں۔ لیکن پھر زمانہ جوں

جوں جوں بڑھتا گیا، یہ تصوّر بھی زیادہ وسعت اور رقّت پیدا کرتا گیا۔ یہاں تک کہ یسعیاہ (Isaiah) ثانی[1] کے زمانہ میں اُس تصوّر کی بنیادیں پڑنے لگیں جو آگے چل کر مسیحی تصور کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ چنانچہ مسیحیت نے شوہر کی جگہ باپ[2] کو دیکھا۔ کیونکہ باپ، اپنے بچوں کے لیے سرتاسر رحم و شفقت اور یکسر قلم عفوو درگزر ہوتا ہے:

من بدکنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو!

اسلام نے اپنے عقیدہ کی بنیاد سرتاسر تنزیہہ پر رکھی۔ لیس کمثلہ شیء میں تشبیہ کی ایسی عام اور قطعی نفی کر دی کہ ہمارے تصوّری تشخّص کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ لا تضربوا للہِ الامثال نے تمثیلوں کے سارے دروازے بند کر دیے لا تدرکہ الابصار اور لن ترانی ولاکن انظر الی الجبل نے ادراکِ حقیقت کی

[1] انیسویں صدی میں ... کے نقد و تدبر کا جو مسلک "انتقادِ اعلیٰ" کے نام سے اختیار کیا گیا تھا، اس کے بعض فیصلے آج تک مسلّم شدہ سمجھے جاتے ہیں۔ ازانجملہ یہ کہ یسعیا نبی کے نام سے جو صحیفہ موجود ہے، وہ تین مختلف مصنفوں نے تین مختلف زمانوں میں مرتب کیا ہوگا۔ باب اول سے باب ۳۹ تک ایک مصنف کا کلام ہے۔ باب ۴۰ سے باب ۵۵ آیت ۱۳ تک دوسرے مصنف کا، اور اس کے بعد کا آخری حصہ تیسرے کا۔ ان تینوں مصنفوں کو امتیاز کے لیے یسعیا اول، ثانی اور ثالث سے موسوم کیا جاتا ہے۔

[2] ہندو تصور نے باپ کی جگہ ماں کی تمثیل اختیار کی تھی۔ کیونکہ ماں کی محبت باپ کی محبت سے بھی زیادہ گہری اور غیر متزلزل ہوتی ہے۔

کوئی اُمید باقی نہ چھوڑی:

زباں ببند و نظر باز کن کہ منعِ کلیم

اشارت از ادب آموزیِ تقاضائی ست!

تاہم انسان کے نظارۂ تصور کے لیے اُسے بھی صفات کی ایک صورت آرائی کرنی ہی پڑی، اور تنزیہہ مطلق نے صفاتی تشخص کا جامہ پہن لیا۔ وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی، فَادْعُوْہُ بِھَا۔ اور پھر صرف اتنے ہی پر معاملہ نہیں رُکا، جابجا مجازات کے جھروکے بھی کھولنے پڑے۔ بل یداہ مبسوطتان، اور ید اللہ فوق ایدیھم اور ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ اور الرحمٰن علی العرش استویٰ اور ان ربک لبالمرصاد اور کل یوم ھو فی شان:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق میں گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

اس سے معلوم ہوا کہ بلندی کے ایک نصب العین کی طلب انسان کی فطرت کی طلب ہے، اور وہ بغیر کسی ایسے تصوّر کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اُس کے سامنے آئے، اور سامنے جبھی آسکتا ہے کہ اس کے مطلق اور غیر مشخص چہرہ پر کوئی نہ کوئی نقاب تشخص کی پڑ گئی ہو:

آہ ازاں حوصلۂ تنگ و ازاں حسنِ بلند

کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدار تو نیست!

غیر صفاتی تصور کو انسانی دماغ پکڑ نہیں سکتا، اور طلب اُسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آسکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسنِ گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لیے اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھا سکے، جس کے ساتھ رازو نیازِ محبت کی راتیں بسر کر سکے۔ جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، لیکن پھر بھی اُسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ انّ ربك لبالمرصاد[1] اور واذا سئلك عبادی عنّی، فانّی قریبٌ۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان[2]

در پردہ و بر ہمہ کس پردہ می دری
باہر کسی و با تو کسے را وصال نیست!

غیر صفاتی تصوّر محض نفی و سلب ہوتا ہے، مگر صفاتی تصوّر نفی تشبہ کے ساتھ ایک ایجابی صورت بھی متشکل کر دیتا ہے۔ اسی لیے یہاں صفات کی نقش آرائیاں ناگزیر ہوئیں، اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں علماءِ سلف اور اصحابِ حدیث نے تفویض کا مسلک اختیار کیا، اور تاویلِ صفات سے گریزاں رہے۔ اور اسی بنا پر اُنھوں نے جہمیّہ کے انکارِ صفات کو تعطّل سے

---

[1] بلاشبہ تیرا پروردگار تجھے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہے۔

[2] اے پیغمبر! جب میری نسبت میرے بندے تجھ سے دریافت کریں تو ان سے کہہ دے میں ان سے دور کب ہوں؟ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

تعبیر کیا اور معتزلہ و متکلمین کی تاویلوں میں بھی تعطیل کی بو سونگھنے لگے متکلمین نے اصحاب حدیث کو تشبہ اور تجسیم (Anthropomorphism) کا الزام دیا تھا، مگر وہ کہتے تھے۔ تمہارے تعقل سے تو ہمارا نام نہاد تشبہ ہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہاں تصور کے لیے ایک ٹھکانا تو باقی رہتا ہے۔ تمہاری سلب و نفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا!

ہندوستان کے اوپنشدوں نے ذاتِ مطلق کو ذاتِ متصف میں اُتار دیتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے، مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر "احدیت" اور "واحدیت" کے مراتب میں دیکھی۔ "احدیت" کا مرتبہ یکتائی محض کا ہوا، لیکن "واحدیت" کی جگہ اوّل کی ہوئی، اور اوّلیت کا مرتبہ چاہتا ہے کہ دوسرا، تیسرا، چوتھا بھی ہو۔ "کنت کنزاً مخفیاً، فاحببت ان اعرف، فخلقت الخلق" حدیث قدسی نہیں ہے، مگر جس کسی کا بھی قول ہے، اس میں شک نہیں کہ ایک بڑے ہی گہرے تفکر کی خبر دیتا ہے:

دل گشتۂ یکتائیِ حسن ست، وگرنہ
در پیشِ تو آئینہ شکستن ہنرے بود!

ترجمان القرآن جلد اوّل میں بہ ضمن تفسیر سورۂ فاتحہ اور جلد دوم میں بہ ضمن تفسیر ولا تضربوا للہ الامثال اس بحث کی طرف اشارات کیے گئے ہیں، اور بحث ایسا ہے کہ اگر پھیلایا جائے تو بہت دور تک پھیل سکتا ہے:

تلقینِ درسِ اہلِ نظر یک اشارت است
کردم اشارتے و مکرّر نمی کنم!

اِس سلسلہ میں ایک اور مقام بھی نمایاں ہوتا ہے، اور اس کی وسعت بھی ہمیں دور دور تک پہنچا دیتی ہے۔ اگر یہاں مادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، تو پھر مرتبۂ انسانی میں اُبھرنے والی وہ قوت جسے ہم فکر و ادراک کے نام سے پکارتے ہیں، کیا ہے؟ کس انگیٹھی سے یہ چنگاری اُڑی؟ یہ کیا ہے جو ہم میں یہ جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ ہم خود مادہ کی حقیقت میں غور و خوض کرنے لگتے ہیں اور اس پر طرح طرح کے احکام لگاتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ موجودات کی ہر چیز کی طرح یہ جوہر بھی بہ تدریج اس درجہ تک پہنچا۔ وہ عرصہ تک نباتات میں سوتا رہا، حیوانات میں کروٹ بدلنے لگا، اور پھر انسانیت کے مرتبہ میں پہنچ کر جاگ اُٹھا لیکن صورتِ حال کا یہ علم ہمیں اس گتھی کے سُلجھانے میں کچھ مدد نہیں دیتا۔ یہ بیج فوراً برگ و بار لے آیا ہو، یا مدتوں کے نشوُ و ارتقا کے بعد اس درجہ تک پہنچا ہو، بہر حال مرتبۂ انسانیت کا جوہر و خلاصہ ہے اور اپنی نمود و حقیقت میں تمام مجمعِ موجودات سے اپنی جگہ الگ اور بالاتر رکھتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان حیوانیت کی پچھلی کڑیوں سے جُدا ہو گیا، اور کسی آئندہ کڑی تک مرتفع ہونے کی استعداد اس کے اندر سر اُٹھانے لگی۔ وہ زمین کی حکمرانی کے تخت پر بیٹھ کر جب اوپر کی طرف نظر اُٹھاتا ہے

تو فضا، کے تمام اجرام اسے اس طرح دکھائی دینے لگتے ہیں، جیسے وہ بھی صرف اُسی کی کاربراریوں کے لیے بنائے گئے ہوں۔ وہ ان کی بھی پیمائشیں کرتا ہے اور ان کے خواص و انفعال پر بھی حکم لگاتا ہے۔ اُسے کارخانۂ قدرت کی لاانتہائیوں کے مقابلہ میں اپنی درماندگیوں کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے، لیکن درماندگیوں کے اس احساس سے اس کی سعی و طلب کی اُمنگیں پژمردہ نہیں ہو جاتیں بلکہ اور زیادہ شگفتگیوں کے ساتھ اُبھرنے لگتی ہیں، اور اُسے اور زیادہ بلندیوں کی طرف اُڑا لے جانا چاہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ فکر و ادراک کی یہ فضاء لامتناہی جو انسان کو اپنی آغوشِ پرواز میں لیے ہوئے اُڑ رہی ہے، کیا ہے؟ کیا اس کے جواب میں اس قدر کہدینا کافی ہوگا کہ یہ محض ایک اندھی بہری قوت ہے جو اپنے طبعی خواص اور طبعی احوال و ظروف سے ترقی کرتی ہوئی فکر و ادراک کا شعلۂ جوالہ بن گئی؟ جو لوگ مادیت کے دائرے سے باہر دیکھنے کے عادی نہیں ہیں، وہ بھی اس کی جرأت بہت کم کر سکے کہ اس سوال کا جواب بلا تامل اثبات میں دے دیں۔

میں ابھی اُس انقلاب کی طرف اشارہ کرنا نہیں چاہتا جو اُنیسویں صدی کے آخر میں رونما ہونا شروع ہوا اور جس نے بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی کلاسیکل طبعیات کے تمام مسلمات یکقلم متزلزل کر دیے ہیں۔ ابھی اس سے الگ رہ کر ایک عام نقطۂ نگاہ سے مسئلہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

اور پھر خود وہ صورتِ حال جسے ہم نشوؤ ارتقا (Evolution) سے

تعبیر کرتے ہیں، کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا وہ ایک خاص رُخ کی طرف انگلی اُٹھائے اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ ہم نے سیکڑوں برس کی سُراغ رسانیوں کے بعد یہ حقیقت معلوم کی کہ تمام موجوداتِ ہستی آج جس شکل و نوعیت میں پائی جاتی ہیں، یہ بہ یک دفعہ ظہور میں نہیں آگئیں۔ یعنے کسی براہِ راست تخلیقی عمل نے انہیں یکایک یہ شکل و نوعیت نہیں دے دی، بلکہ ایک تدریجی تغیّر کا عالمگیر قانون یہاں کام کرتا رہا ہے، اور اس کی اطاعت و انقیاد میں ہر چیز درجہ بدرجہ بدلتی رہتی ہے، اور ایک ایسی آہستہ چال سے جسے ہم فلکی اعداد و شمار کی مدتوں سے بھی بہ مشکل اندازہ میں لا سکتے ہیں نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے۔ ذرات سے لیکر اجرامِ سماوی تک، سب نے اسی قانونِ تغیر و تحوّل کے ماتحت اپنی موجودہ شکل و نوعیت کا جامہ پہنا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف چڑھتی ہوئی رفتارِ فطرت ہے جسے ہم "نشو و ارتقا" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنے ایک معین، طے شدہ، ہم آہنگ اور منظم، ارتقائی تقاضہ ہے جو تمام کارخانۂ ہستی پر چھایا ہوا ہے، اور اُسے کسی خاص رُخ کی طرف اُٹھائے اور بڑھائے لئے جا رہا ہے۔ ہر نچلی کڑی بہ تدریج اپنے سے اوپر کی کڑی کا درجہ پیدا کریگی، اور ہر اوپر کا درجہ نچلے درجہ کی رفتارِ حال پر ایک خاص طرح کا اثر ڈالتے ہوئے اُسے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا رہیگا۔ یہ ارتقائی صورتِ حال خود توضیح (Self-explanatory) نہیں ہے۔ یہ اپنی ایک توضیح چاہتی ہے۔ لیکن

کوئی مادی توضیح ہمیں ملتی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیوں صورتِ حال ایسی ہی ہوئی کہ یہاں ایک ارتقائی تقاضہ موجود ہو، اور وہ ہر تخلیقی ظہور کو نچلی حالتوں سے اُٹھاتا ہوا بلند تر درجوں کی طرف بڑھاتے لے جائے؟ کیوں فطرتِ وجود میں رفعت طلبیوں کا ایسا تقاضہ پیدا ہوا کہ سلسلۂ اجسام کی ایک مرتب سیڑھی نیچے سے اوپر تک اُٹھتی ہوئی چلی گئی جس کا ہر درجہ اپنے مابعد سے اوپر مگر اپنے ماسبق سے نیچے واقع ہوا ہے؟ کیا یہ صورتِ حال بغیر کسی معنی اور حقیقت کے ہے؟ کیا یہ سیڑھی بغیر کسی بالاخانہ کی موجودگی کے بن گئی، اور یہاں کوئی بامِ رفعت نہیں جس تک یہ ہمیں پہنچانا چاہتی ہو؟

یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست!

زمانۂ حال کے علماء علم الحیات میں پروفیسر لائیڈ مارگن (Lloyd morgan) نے اس مسئلہ کا علم الحیاتی (Biological) نقطۂ خیال سے گہرا مطالعہ کیا ہے، لیکن بالآخر اُسے بھی اسی نتیجہ تک پہنچنا پڑا کہ اس صورتِ حال کی کوئی مادّی توضیح نہیں کی جا سکتی۔ وہ لکھتا ہے کہ جو حاصلات (Resultants) یہاں کام کر رہی ہیں، ہم اُن کی توضیح اس اعتبار سے تو کر سکتے ہیں کہ انہیں موجودہ احوال و ظروف کا نتیجہ قرار دیں، لیکن ارتقائی تقاضہ کا فجائی ظہور (Emergens) جس طرح اُبھر تا رہا ہے۔ مثلاً زندگی کی نمود، ذہن و ادراک کی جلوہ طرازی، ذہنی شخصیت

اور معنوی انفرادیت کا ڈھلاؤ، اُن کی کوئی توضیح بغیر اس کے نہیں کی جاسکتی کہ ایک الٰہی قوت کی کارفرمائی یہاں تسلیم کرلی جائے۔ ہمیں یہ صورتِ حال بالآخر مجبور کردیتی ہے کہ فطرتِ کائنات میں ایک تخلیقی اصل (Creative Principle) کی کارفرمائی کے اعتقاد سے گریز نہ کریں۔ ایک ایسی تخلیقی اصل، جو اس کارخانۂ ظرف و زمان میں ایک لازمان (Timeless) حقیقت ہے!

حقائقِ ہستی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ایک خاص بات فوراً ہمارے سامنے اُبھرنے لگتی ہے۔ یہاں فطرت کا ہر نظام کچھ اس طرح کا واقع ہوا ہے، کہ جب تک اُسے اس کی سطح سے بلند ہوکر نہ دیکھا جائے، اس کی حقیقت بے نقاب نہیں ہوسکتی۔ یعنے فطرت کے ہر نظم کو دیکھنے کے لیے ہمیں ایک ایسا مقامِ نظر پیدا کرنا پڑتا ہے جو خود اُس سے بلند تر جگہ پر واقع ہے۔ عالمِ طبیعیات کے غوامض علم الحیاتی (Biological) عالم میں کھُلتے ہیں۔ علم الحیاتی غوامض نفسیاتی (Psychological) عالم میں نمایاں ہوتے ہیں۔ نفسیاتی غوامض کے لیے ہمیں منطقی بحث و تحلیل کے عالم میں آنا پڑتا ہے لیکن منطقی بحث و تحلیل کے معموں کو کس مقام سے دیکھا جائے؟ اس سے اوپر بھی کوئی مقامِ نظر ہے یا نہیں جو حقیقت کی کسی آخری منزل تک ہمیں پہنچا دے سکتا ہو؟

ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس سے اوپر بھی ایک مقامِ نظر ہے۔ لیکن وہ اس سے بلند تر ہے کہ عقلی نظر و تحلیل سے اس کی نقش آرائی کی جا سکے۔ وہ ماورائے محسوسات (Supra sensible) ہے۔ اگرچہ محسوسات سے معارض نہیں۔ وہ ایک ایسی آگ ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی۔ البتہ اس کی گرمی سے ہاتھ تاپ لیے جا سکتے ہیں۔ و من لم یذق، لم یدر:

تو نظر باز نۂ، ورنہ تغافل نگہ ست

تو زباں فہم نۂ، ورنہ خموشی سخن ست!

کائنات ساکن نہیں ہے۔ متحرک ہے، اور ایک خاص رُخ پر بنتی اور سنورتی ہوئی بڑھی چلی جا رہی ہے۔ اس کا اندرونی تقاضہ ہر گوشہ میں تعمیر و تکمیل ہے۔ اگر کائنات کی اس عالمگیر ارتقائی رفتار کی کوئی مادی توضیح ہمیں نہیں ملتی، تو ہم غلطی پر نہیں ہو سکتے اگر اس معمّہ کا حل روحانی حقائق میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں۔

اس موقعہ پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ مادہ کی نوعیت کے بارے میں اٹھارویں اور اُنیسویں صدی نے جو عقائد پیدا کیے تھے، وہ اس صدی کے شروع ہوتے ہی ہلنا شروع ہو گئے، اور اب یکسر منہدم ہو چکے ہیں۔ اب ٹھوس مادہ کی جگہ مجرد قوت نے لے لی ہے، اور الکٹرون (Electron) کے خواص و افعال اور سالمات کے اعدادی شماری

انضباط کے مباحث نے معاملہ کو سائنس کے دائرہ سے نکال کر پھر فلسفہ کے صحرا میں گم کردیا ہے۔ سائنس کو اپنی خارجیّت (Objective) کے علم و انضباط کا جو یقین تھا، وہ اب یکسر متزلزل ہوچکا، اور علم پھر داخلیت (Subjective) کے اُسی ذہنی اور کلیاتی مقام پر واپس لوٹ رہا ہے جہاں سے نشأۃ جدیدہ کے دور کے بعد اُس نے نئی مسافرت کے قدم اُٹھائے تھے۔ لیکن میں ابھی یہ داستان نہیں چھیڑونگا کیونکہ بجائے خود یہ ایک مستقل بحث ہے۔

یہ سچ ہے کہ یہ راہ محض استدلالی ذریعۂ علم سے طے نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی اصلی روشنی کشف و مشاہدہ کی روشنی ہے۔ لیکن اگر ہم کشف و مشاہدہ کے عالم کی خبر نہیں رکھنی چاہتے جب بھی حقیقت کی نشانیاں اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں، اور اگر غور کریں تو خود ہماری ہستی ہی سرتاسر نشانِ راہ ہے۔
ولقد احسن من قال:

خلقے نشانِ دوست طلب می کنند و باز
از دوست غافل اند بہ چندیں نشاں کہ ہست!

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۵- دسمبر ۴۲ء

صدیق مکرم، پانچویں صلیبی حملہ کی سرگزشت ایک فرانسیسی مجاہد (Crusader) ژ سے آن دہ ژواین ویل (Jean De Jainville) نامی نے بطور یادداشت کے قلمبند کی تھی۔ اس کے کئی انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ زیادہ متداول نسخہ ایوری مینس لائبریری کا ہے۔

پانچواں صلیبی حملہ سینٹ لوئس (Lewis) شاہِ فرانس نے براہِ راست مصر پر کیا تھا۔ دمیاط (Demietta) کا عارضی قبضہ، قاہرہ کی طرف اقدام، ساحلِ نیل کی لڑائی، صلیبیوں کی شکست، خود سینٹ لوئس کی گرفتاری، اور زرفدیہ کے معاہدہ پر رہائی، تاریخ کے مشہور واقعات ہیں، اور عرب مورخوں نے ان کی تمام تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ لوئس رہائی کے بعد عکّہ (Acre) آیا جو چند دوسرے ساحلی مقامات کے ساتھ صلیبیوں کے قبضہ میں باقی رہ گیا تھا، اور کئی سال تک وہاں مقیم رہا۔ ژواین ویل نے یہ تمام زمانہ لوئس کی ہمراہی میں بسر کیا تھا، مصر اور عکّہ کے تمام اہم واقعات اس کے چشم دید واقعات ہیں۔

لوئس ۱۲۴۸ء میں فرانس سے روانہ ہوا۔ دوسرے سال دمیاط پہنچا

تیسرے سال عکّہ، پھر ۱۲۵۴ء میں فرانس واپس ہوا۔ یہ سنین اگر ہجری سنین سے مطابق کیے جائیں تو تقریباً ۶۴۶ھ اور ۶۵۲ھ ہوتے ہیں۔

ژواین ویل جب لوئس کے ہمراہ فرانس سے روانہ ہوا تو اس کی عمر چوبیس برس کی تھی۔ لیکن یہ یادداشت اس نے بہت عرصہ کے بعد اپنی زندگی کے آخری سالوں میں لکھی۔ یعنی ۱۳۰۹ء (۷۰۸ھ) میں جب اس کی عمر خود اُس کی تصریح کے مطابق پچاسی برس کی ہو چکی تھی، اور صلیبی حملہ کے واقعات پر نصف صدی کی مدت گزر چکی تھی۔ اس طرح کی کوئی تصریح موجود نہیں جس کی بنا پر خیال کیا جا سکے کہ مصر اور فلسطین کے قیام کے زمانہ میں وہ اہم واقعات قلمبند کر لیا کرتا تھا۔ پس جو کچھ اُس نے لکھا ہے، وہ پچاس برس پیشتر کے حوادث کی ایک ایسی روایت ہے جو اس کے حافظہ نے محفوظ رکھ لی تھی۔ بااین ہمہ اس کے بیانات جہاں تک واقعاتِ جنگ کا تعلق ہے، عام طور پر قابلِ وثوق تسلیم کیے گئے ہیں۔

مسلمانوں کے دینی عقائد و اعمال اور اخلاق و عادات کی نسبت اس کی معلومات ازمنۂ وسطیٰ کی عام فرنگی معلومات سے چنداں مختلف نہیں، تاہم درجہ کا فرق ضرور ہے۔ چونکہ اب یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے باہمی تعلقات پر جو صلیبی لڑائیوں کے سایے میں نشوونما پاتے رہے تھے، تقریباً ڈیڑھ سو برس کا زمانہ گزر چکا تھا، اور فلسطین کے نوآباد صلیبی مجاہد اب مسلمانوں کو زیادہ قریب ہو کر دیکھنے

لگے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ژواین ویل کے ذہنی تاثرات کی نوعیت اُن تاثرات کی نوعیت سے مختلف دکھائی دیتی ہے جو ابتدائی عہد کے صلیبیوں کے رہ چکے ہیں۔ مسلمان کافر ہیں، ہیدین (Heathen) ہیں، پے نیم (Paynim) ہیں، پے گن (Paygan) ہیں، مسیحؑ کے دشمن ہیں، تاہم کچھ اچھی باتیں بھی اُن کی نسبت خیال میں لائی جا سکتی ہیں، اور اُن کے طور طریقہ میں تمام باتیں بُری ہی نہیں ہیں۔ مصری حکومت اور اس کے ملکی اور فوجی نظام کے بارے میں اُس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ستر فی صدی کے قریب صحیح ہے لیکن مسلمانوں کے دینی عقائد و اعمال کے بیانات میں پچیس[۲۷] فی صدی سے زیادہ صحت نہیں۔ پہلی معلومات غالباً اس کی ذاتی ہیں، اس لیے صحت سے قریب تر ہیں۔ دوسری معلومات زیادہ تر فلسطین کے کلیسائی حلقوں سے حاصل کی گئی ہیں، اس لیے تعصب و نفرت پر مبنی ہیں۔ اُس عہد کی عام فضا دیکھتے ہوئے یہ صورتِ حال چنداں تعجب انگیز نہیں۔

ایک عرصے کے بعد مجھے اس کتاب کے دیکھنے کا یہاں پھر اتفاق ہوا۔ ایک رفیق زنداں نے ایوری مینس لائبریری کی کچھ کتابیں منگوائی تھیں، اُن میں یہ بھی آگئی۔ اس سلسلہ میں دو واقعات خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں۔

قیامِ عکہ کے زمانے میں لوئس نے ایک سفیر سلطان دمشق کے پاس

بھیجا تھا جس کے ساتھ ایک شخص ایوے لابریتان (Yves la Bretan) بطور مترجم کے گیا تھا۔ یہ شخص مسیحی واعظوں کے ایک حلقہ سے تعلق رکھتا تھا اور "مسلمانوں کی زبان" سے واقف تھا۔ "مسلمانوں کی زبان" سے مقصود یقیناً عربی زبان ہے۔ ژواین ویل اس سفارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جب سفیر اپنی قیام گاہ سے شلدان (سلطان) کے محل کی طرف جا رہا تھا، تو لابریتان کو راستہ میں ایک مسلمان بڑھیا عورت ملی۔ اس کے دہنے ہاتھ میں ایک برتن آگ کا تھا۔ بائیں ہاتھ میں پانی کی صراحی تھی۔ لابریتان نے اس عورت سے پوچھا "یہ چیزیں کیوں اور کہاں لے جا رہی ہو؟" عورت نے کہا "میں چاہتی ہوں اس آگ سے جنت کو جلا دوں اور پانی سے جہنم کی آگ بجھا دوں تاکہ پھر دونوں کا نام و نشان باقی نہ رہے" لابریتان نے کہا۔ تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو؟ اُس نے جواب دیا "اس لیے، تاکہ کسی انسان کے لیے اس کا موقعہ باقی نہ رہے کہ جنت کے لالچ اور جہنم کے ڈر سے نیک کام کرے۔ پھر وہ جو کچھ کرے گا صرف خدا کی محبت کے لیے کرے گا"!

(Memoirs of The Crusades: 248)

اس روایت کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ بجنسہٖ یہی عمل اور یہی قول حضرت رابعہ بصریہ سے منقول ہے۔ اس وقت کتابیں یہاں موجود نہیں، لیکن حافظہ سے مدد لے کر کہہ سکتا ہوں کہ قشیری، ابو طالب مکی، فرید الدین عطار، صاحب

عرائس المجالس، صاحبِ روح البیان، اور شعرانی، سب نے یہ قول نقل کیا ہے اور اسے رابعۂ بصریّہ کے فضائل مقامات میں سے قرار دیا ہے۔

رابعہ بصریّہ پہلے طبقہ کی کبار صوفیہ میں شمار کی گئی ہیں۔ دوسری صدی ہجری یعنے آٹھویں صدی مسیحی میں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ایک دن اس عالم میں گھر سے نکلیں کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن تھا۔ دوسرے میں پانی کا کوزہ۔ لوگوں نے پوچھا کہاں جارہی ہو؟ جواب میں بجنسہ وہی بات کہی جو لا بر تیان نے دمشق کی عورت کی زبانی نقل کی ہے "آگ سے جنت کو جلا دینا چاہتی ہوں۔ پانی سے دوزخ کی آگ بجھا دینی چاہتی ہوں۔ تاکہ دونوں ختم ہو جائیں اور پھر لوگ خدا کی عبادت صرف خدا کے لیے کریں۔ جنت و دوزخ کے طمع و خوف سے نہ کریں" قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کی رابعہ بصریّہ کا مقولہ کس طرح ساتویں صدی ہجری کی ایک عورت کی زبان پر طاری ہو گیا جو دمشق کی سڑک سے گزر رہی تھی؟ یہ کیا بات ہے کہ تعبیر معارف کی ایک خاص تمثیل (پارٹ) جو پانچ سو برس پہلے بصرہ کے ایک کوچہ میں دکھائی گئی تھی، بعینہ اب دمشق کی ایک شاہرہ پر دُہرائی جا رہی ہے؟ کیا یہ محض افکار و احوال کا توارُد ہے؟ یا تکرار اور نقالی ہے؟ یا پھر راوی کی ایک افسانہ تراشی؟

ہر توجیہ کے لیے قرائن موجود ہیں اور معاملہ مختلف بھیسوں میں سامنے آتا ہے

زا، یہ وہ زمانہ تھا جب صلیبی جماعتوں کی قوت فلسطین میں پاش پاش ہو چکی تھی۔ ساحل کی ایک چھوٹی سی دھجّی کے سوا ان کے قبضہ میں اور کچھ باقی نہیں رہا تھا، اور وہاں بھی امن چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ رات دن کے لگاتار حملوں اور محاصروں سے پامال ہوتے رہتے تھے۔ لوئس اُن کی اعانت کے لیے آیا لیکن وہ خود اعانت کا محتاج ہو گیا۔ جنگی قوت کے افلاس سے کہیں زیادہ اُن کا اخلاقی افلاس اُنہیں تباہ کر رہا تھا۔ ابتدائی عہد کا مجنونانہ مذہبی جوش و خروش جو تمام یورپ کو بہا لے گیا تھا، اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا، اور اس کی جگہ ذاتی خود غرضیاں اور صلیبی حلقہ بندیوں کی باہمی رقابتیں کام کرنے لگی تھیں۔ پے در پے شکستوں اور ناکامیوں سے جب ہمتیں پست ہوئیں تو اصل مقصد کی کشش بھی کمزور پڑ گئی اور بدعملیوں اور ہوس رانیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ مذہبی پیشواؤں کی حالت امراء اور عوام سے بھی بدتر تھی۔ دینداری کے اخلاص کی جگہ ریاکاری اور نمائش ان کا سرمایۂ پیشوائی تھا۔ ایسے افراد بہت کم تھے جو واقعی مخلص اور پاک عمل ہوں۔

جب اُس عہد کے مسلمانوں کی زندگی سے اس صورتِ حال کا مقابلہ کیا جاتا تھا تو مسیحی زندگی کی مذہبی اور اخلاقی پستی اور زیادہ نمایاں ہونے لگتی تھی۔ مسلمان اب صلیبیوں کے ہمسایہ بن گئے تھے اور التوائے جنگ کے بڑے بڑے وقفوں نے باہمی میل جول کے دروازے دونوں پر کھول دیے تھے۔ صلیبیوں میں جو لوگ پڑھے لکھے تھے، ان میں سے بعض نے شامی عیسائیوں کی مدد سے مسلمانوں

کی زبان بھی سیکھ لی تھی اور ان کے مذہبی اور اخلاقی افکار و عقائد سے واقفیت پیدا کرنے لگے تھے۔ کلیسائی واعظوں کے جو حلقے یہاں کام کر رہے تھے اُن میں بھی بعض متجسس طبائع ایسے پیدا ہو گئے تھے جو مسلمان عالموں اور صوفیوں سے ملتے اور دینی اور اخلاقی مسائل پر مذاکرے کرتے۔ اُس عہد کے متعدد عالموں اور صوفیوں کے حالات میں ایسی تصریحات ملتی ہیں کہ صلیبی قسیس اور رہبان ان کے پاس آئے اور باہمدگر سوال و جواب ہوئے۔ بعض مسلمان علماء جو صلیبیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے تھے، عرصہ تک ان میں رہے اور ان کے مذہبی پیشواؤں سے مذہبی مباحثے کیے۔ شیخ سعدی شیرازی کو اسی عہد میں صلیبیوں نے گرفتار کر لیا تھا، اور اُنہیں عرصہ تک طرابلس میں گرفتاری کے دن کاٹنے پڑے تھے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صلیبیوں میں جو لوگ مخلص، اور اثر پذیر طبیعتیں رکھتے تھے وہ اپنے گروہ کی حالت کا مسلمانوں کی حالت سے مقابلہ کرتے۔ وہ مسلمانوں کا مذہبی اور اخلاقی تفوق دکھا کر عیسائیوں کو غیرت دلاتے کہ اپنی نفس پرستیوں اور بدعملیوں سے باز آئیں اور مسلمانوں کی دینداراَنہ زندگی سے عبرت پکڑیں۔ چنانچہ خود ژواین ویل کی سرگزشت میں جابجا اس ذہنی انفعال کی جھلک اُبھرتی رہتی ہے۔ متعدد مقام ایسے ملتے ہیں جہاں وہ مسلمانوں کی زبانی اس طرح کے اقوال نقل کرتا ہے جس سے عیسائیوں کے لیے عبرت اور تنبہ کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی دمشق کی سفارت کے سلسلہ میں اس نے

جان دی آرمینین (John The Armenian) کے سفرِ دمشق کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ شخص دمشق اس لیے گیا تھا کہ کمانیں بنانے کے لیے سینگ اور سریش خرید کرے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے دمشق میں ایک عمر رسیدہ مسلمان ملا جس نے میری وضع قطع دیکھ کر پوچھا "کیا تم مسیحی ہو؟" میں نے کہا ہاں۔ مسلمان شیخ نے کہا "تم مسیحی آپس میں ایک دوسرے سے اب نفرت کرنے لگے ہو اسی لیے ذلیل و خوار ہو رہے ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں نے یروشلم کے صلیبی بادشاہ بالڈوین (Baldwin) کو دیکھا تھا۔ وہ کوڑھی تھا اور اس کے ساتھ مسلح آدمی صرف تین سو تھے۔ پھر بھی اُس نے اپنے جوش و ہمت سے سالادین (صلاح الدین) کو پریشان کر دیا تھا۔ لیکن اب تم اپنے گناہوں کی بدولت اتنے گر چکے ہو کہ ہم جنگلی جانوروں کی طرح تمہیں رات دن شکار کرتے رہتے ہیں"

پس ممکن ہے کہ لابرییان ایسے ہی لوگوں میں سے ہو جنہیں مسلمان صوفیوں کے اعمال و اقوال سے یک گونہ واقفیت حاصل ہو گئی ہو، اور وہ وقت کے ہر معاملہ کو عیسائیوں کی عبرت پذیری کے لیے کام میں لانا چاہتا ہو۔ لابرییان کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ مسیحی واعظوں کے حلقہ سے وابستگی رکھتا تھا اور عربی زبان سے واقف تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ اُسے اُن خیالات سے واقفیت کا موقعہ ملا ہو جو اُس عہد کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر پائے جاتے تھے۔ چونکہ رابعہ بصریہ کا یہ مقولہ عام طور پر مشہور تھا، اور مسلمانوں کے میل جول سے

اُس کے علم میں آچکا تھا، اس لیے سفرِ دمشق کے موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے ایک عبرت انگیز کہانی گڑھ لی۔ مقصود یہ تھا کہ عیسائیوں کو دین کے اخلاصِ عمل کی ترغیب دلائی جائے، اور دکھایا جائے کہ مسلمانوں میں ایک بڑھیا عورت کے اخلاصِ عمل کا جو درجہ ہے، وہ اُس تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ژواین ویل کے علم میں یہ مقولہ آیا ہو اور اُس نے رابعہ کی طرف منسوب کر کے اسے دمشق کے ایک بروقت واقعہ کی شکل دیدی ہو۔

ہمیں معلوم ہے کہ انیسویں صدی کے نقادوں نے ژواین ویل کو صلیبی عہد کا ایک ثقہ راوی قرار دیا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ بظاہر ایک دیندار اور مخلص مسیحی تھا، جیسا کہ اس کی تحریر سے جابجا مترشح ہوتا ہے، تاہم یہ ضروری نہیں کہ ایک دیندار راوی ہیں دینی اور اخلاقی اغراض سے مفید مقصد روایتیں گڑھنے کی استعداد نہ رہی ہو۔ فنِ روایت کی گہرائیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ نیک سے نیک انسان بھی بعض اوقات جعل و صناعت کے تقاضوں سے اپنی نگرانی نہیں کر سکتے۔ وہ اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر کسی نیک مقصد کے لیے ایک مصلحت آمیز جعلی روایت گڑھ لی جائے تو کوئی گناہ کی بات نہیں۔ مسیحی مذہب کے ابتدائی عہدوں میں جن لوگوں نے حواریوں کے نام سے طرح طرح کے نوشتے گڑھے تھے اور جنہیں آگے چل کر کلیسا نے غیر معروف و مدفون (Apocrypha) نوشتوں میں شمار کیا، وہ یقیناً بڑے ہی

دیندار اور مقدس آدمی تھے تاہم یہ دینداری انہیں اس بات سے نہ روک سکی کہ حواریوں کے نام سے جعلی نوشتے طیار کرلیں۔

تاریخِ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جن لوگوں نے بے شمار جھوٹی حدیثیں بنائیں، ان میں ایک گروہ دیندار واعظوں اور مقدس زاہدوں کا بھی تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ لوگوں میں دینداری اور نیک عملی کا شوق پیدا کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں گڑھ کر سنانا کوئی بُرائی کی بات نہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کو کہنا پڑا کہ حدیث کے واضعوں میں سب سے زیادہ خطرناک گروہ ایسے ہی لوگوں کا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ یہ زمانہ یعنے ساتویں صدی ہجری کا زمانہ صوفیانہ افکار و اعمال کے شیوع و احاطہ کا زمانہ تھا۔ تمام عالم اسلامی خصوصاً بلادِ مصر و شام میں وقت کی مذہبی زندگی کا عام رجحان تصوف اور تصوف آمیز خیالات کی طرف جا رہا تھا۔ ہر جگہ کثرت کے ساتھ خانقاہیں بن گئی تھیں، اور عوام اور امراء، دونوں کی عقیدت مندیاں اُنہیں حاصل تھیں۔ تصوف کی اکثر متداول مصنفات تقریباً اسی صدی اور اس کے بعد کی صدی میں مدوّن ہوئیں۔ حافظ ذہبی جنہوں نے اس زمانہ سے ساٹھ ستّر برس بعد اپنی مشہور تاریخ لکھی ہے، لکھتے ہیں کہ اس عہد کے تمام ملوک اور امراءِ اسلام صوفیوں کے زیرِ اثر تھے۔ مقریزی نے تاریخِ مصر میں جن خانقاہوں کا حال لکھا ہے،

ان کی بڑی تعداد تقریباً اسی عہد کی پیداوار ہے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ جن صلیبیوں کو مسلمانوں کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ ملا ہو، وہ مسلمان صوفیوں کے اقوال پر مطلع ہو گئے ہوں۔ کیونکہ وقت کا عام رنگ یہی تھا۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ لابرتیان ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں افسانہ سرائی اور حکایت سازی کا ایک قدرتی تقاضہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بغیر کسی مقصد کے بھی محض سامعین کا ذوق و استعجاب حاصل کرنے کے لیے فرضی واقعات گڑھ لیا کرتے ہیں۔ دنیا میں فنِ روایت کی آدھی غلط بیانیاں راویوں کے اسی جذبۂ داستان سرائی سے پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں میں وعاظ و قصاص کا گروہ یعنے واعظوں اور قصہ گویوں کا گروہ محض سامعین کے استعجاب و توجہ کی تحریک کے لیے سیکڑوں روایتیں برجستہ گڑھ لیا کرتا تھا، اور پھر وہی روایتیں قیدِ کتابت میں آکر ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی نوعیت پیدا کر لیتی تھیں۔ ملا معین واعظ کاشفی وغیرہ کی مصنفات ایسے قصوں سے بھری ہوئی ہیں۔

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ صحیح ہو، اور اُس عہد میں ایک ایسی صوفی عورت موجود ہو جس نے رابعۂ بصریہ والی بات بطورِ نقل و اتباع کے یا واقعی اپنے استغراقِ حال کی بنا پر دُہرا دی ہو۔

افکار و احوال کے اشباہ و امثال ہمیشہ مختلف وقتوں اور مختلف شخصیتوں میں سر اُٹھاتے رہتے ہیں، اور فکر و نظر کے میدان سے کہیں زیادہ احوال و واردات کا میدان اپنی یک رنگیاں اور ہم آہنگیاں رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ساتویں صدی کی ایک صاحبِ حال عورت کی زبان سے بھی اخلاصِ عمل اور عشقِ الٰہی کی وہی تعبیر نکل گئی ہو جو دوسری صدی کی رابعہ بصریہ کی زبان سے نکلی تھی۔ افسوس ہے کہ یہاں کتابیں موجود نہیں۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس عہد کے صوفیاءِ دمشق کے حالات میں کوئی سُراغ مل جاتا۔ ساتویں صدی کا دمشق تصوف و اصحابِ تصوف کا دمشق تھا۔

یہ یاد رہے کہ تذکروں میں ایک رابعہ شامیہ کا بھی حال ملتا ہے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو جامی نے بھی نفحات کے آخر میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ لیکن ان کا عہد اس سے بہت پیشتر کا ہے۔ اس عہد کے شام میں ان کی موجودگی تصور میں نہیں لائی جا سکتی۔

(۴) آخری امکانی صورت جو سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس عہد میں کوئی نمایش پسند عورت تھی جو بطورِ نقالی کے صوفیوں کا پارٹ دکھایا کرتی تھی، اور وہ لابرتیان سے دوچار ہو گئی۔ یا یہ سُن کر کہ عکہ کی مسیحی سفارت آرہی ہے، قصداً اُس کی راہ میں آگئی۔ مگر یہ سب سے زیادہ بعید اور دور از قرائن صورت ہے جو ذہن میں آسکتی ہے۔

ڑوا ین ویل نے ایک دوسرا واقعہ "دی اولڈ مین آف دی ماؤنٹین" کی سفارت کا نقل کیا ہے۔ یعنے کوہستانِ الموت۔کے "شیخ الجبال" کی سفارت کا۔جیسا کہ آپ کو معلوم ہے "شیخ الجبال" کے لقب سے پہلے حسن بن صباح ملقب ہوا تھا۔ پھر اس کا ہر جانشین اسی لقب سے پکارا جانے لگا۔ فرقہ باطنیہ کی دعوت کا یہ عجیب وغریب نظام تاریخ عالم کے عزائب حوادث میں سے ہے۔ یہ بغیر کسی بڑی فوجی طاقت۔کے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک قائم رہا، اور مغربی ایشیا کی تمام طاقتوں کو اس کی ہولناکی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس نے یہ اقتدار فوج اور مملکت کے ذریعہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ صرف جانفروش فدائیوں کے بے پناہ قاتلانہ حملے تھے۔ جنھوں نے اُسے ایک ناقابل تسخیر طاقت کی حیثیت دے دی تھی۔ وقت کا کوئی پادشاہ، کوئی وزیر، کوئی امیر، کوئی سربر آوردہ انسان ایسا نہ تھا جس کے پاس اُس کا پُراسرار خنجر نہ پہنچ جاتا ہو۔ اس خنجر کا پہنچنا اس بات کی علامت تھی کہ اگر شیخ الجبال کی فرمایش کی تعمیل نہیں کی جائیگی تو بلا تامل قتل کر دیے جاؤ گے۔ یہ فدائی تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سایے کی طرح پیچھا کرتے اور آسیب کی طرح محفوظ سے محفوظ گوشوں میں پہنچ جاتے

صلیبی جنگ آزماؤں کا بھی ان سے سابقہ پڑا۔ کئی ٹمپلر (Templar) اور ہاسپٹلر (Hospitaller) فدائیوں کے خنجروں کا نشانہ بنے اور بالآخر مجبور ہو گئے کہ شیخ الجبال کی فرمائشوں کی تعمیل کریں۔ یروشلم (بیت المقدس)

جب صلیبیوں نے فتح کیا تھا اور بالڈوین تخت نشین ہوا تھا تو اُسے بھی ایک سالانہ رقم بطورِ نذر کے التموت بھیجنی پڑی تھی۔ فریڈرک ثانی جب ۱۲۲۹ء میں سلطانِ مصر کی اجازت لے کر یروشلم کی زیارت کے لیے آیا تو اُس نے بھی اپنا ایک سفیر گرانقدر تحفوں کے ساتھ شیخ الجبال کے پاس بھیجا تھا۔ یورپ میں قلعہ التموت کے عجائب کی حکایتیں انہی صلیبیوں کے ذریعہ پھیلیں جو بعد کی مصنفات میں بھی طرح طرح کے ناموں سے ملتی ہیں۔ اُنیسویں صدی کے بعض افسانہ نگاروں نے اسی مواد سے اپنے افسانوں کی نقش آرائیاں کیں، اور بعض اس دعوے میں پڑ گئے کہ شیخ الجبال سے مقصود کوہستانِ شام کا کوئی پُر اسرار شیخ تھا جس کا صدر مقام لبنان تھا!

ژواین ویل لکھتا ہے:

"عکہ میں بادشاہ (لوئس) کے پاس کوہستان کے "اولڈ مین" کے ایلچی آئے۔ ایک امیر عمدہ لباس میں ملبوس آگے تھا، اور ایک خوش پوش نوجوان اس کے پیچھے۔ نوجوان کی مٹھی میں تین چھریاں تھیں جن کے پھل، ایک دوسرے کے دستہ میں پیوست تھے۔ یہ چھریاں اس غرض سے تھیں کہ اگر بادشاہ امیر کی پیش کردہ تجویز منظور نہ کرے تو اُنہیں بطورِ مقابلہ کی علامت کے پیش کر دیا جائے۔ نوجوان کے پیچھے ایک دوسرا نوجوان تھا۔ اس کے بازو پر ایک چادر لپٹی ہوئی تھی۔ یہ اس غرض سے تھی کہ اگر بادشاہ سفارت کا مطالبہ منظور کرنے سے انکار کر دے

تو یہ چادر اُس کے کفن کے لیے پیش کر دی جائے (یعنے اُسے متنبہ کر دیا جائے کہ اب اس کی موت ناگزیر ہے)"

"امیر نے بادشاہ سے کہا۔ میرے آقا نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ سے پوچھوں۔ آپ انہیں جانتے ہیں یا نہیں؟ بادشاہ نے کہا۔ میں نے ان کا ذکر سُنا ہے۔ امیر نے کہا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ نے اس وقت تک انہیں اپنے خزانے کے بہترین تحفے نہیں بھیجے جس طرح جرمنی کے شہنشاہ، ہنگری کے بادشاہ، "بابل" کے سُلدان (سلطان) اور دوسرے سلاطین اُنہیں سال بسال بھیجتے رہتے ہیں؟ ان تمام بادشاہوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی زندگیاں میرے آقا کی مرضی پر موقوف ہیں۔ وہ جب چاہے، ان کی زندگیوں کا خاتمہ کرا دے سکتا ہے"

اس مکالمہ میں شہنشاہ جرمنی اور شاہ ہنگری کے سال بسال تحائف و نذور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے صرف ایک ہی مرتبہ اپنے زمانۂ ورودِ فلسطین میں تحفے نہیں بھیجے تھے بلکہ ہر سال بھیجتے رہے تھے۔ "سُلدان بابل" سے مقصود سلطان مصر ہے۔ کیونکہ صلیبی زمانے کے فرنگی عام طور پر قاہرہ کو "بابل" کے نام سے پکارتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ جس بابل کا ذکر کتب مقدسہ میں آیا ہے، وہ یہی شہر ہے۔ چنانچہ اس عہد کی تمام رزمیہ نظموں میں بار بار "بابل" کا نام آتا ہے۔ ایک صلیبی نائٹ کا سب

سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ کافروں کو رگیدتا ہوا ایسے مقام تک چلا گیا۔ جہاں سے "بابل" کے سر بفلک منارے صاف دکھائی دیتے تھے!

اس کے بعد ژواین ویل لکھتا ہے کہ اُس زمانہ میں شیخ الجبال ٹمپل اور ہاسپٹل کو ایک سالانہ رقم بطور خراج کے دیا کرتا تھا کیونکہ ٹمپلر اور ہاسپٹلر اس کے قاتلانہ حملوں سے بالکل نڈر تھے اور وہ انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ شیخ الجبال کے سفیر نے کہا "اگر بادشاہ میرے آقا کی فرمایش کی تعمیل نہیں کرنی چاہتا تو پھر یہی کرے کہ جو خراج ٹمپل کو ادا کیا جاتا ہے، اُس سے میرے آقا کو بری الذمہ کرا دے"۔ بادشاہ نے یہ پورا معاملہ ٹمپلرس کے حوالہ کر دیا۔ ٹمپلرس نے دوسرے دن سفیر کو بلایا اور کہا "تمہارے آقا نے یہ بڑی غلطی کی کہ اس طرح کا گستاخانہ پیغام بادشاہِ فرانس کو بھیجا۔ اگر بادشاہ کے احترام سے ہم مجبور نہ ہوتے جس کی حفاظت تمہیں بہ حیثیت سفیر کے حاصل ہے، تو ہم تمہیں پکڑ کے سمندر کی موجوں کے حوالہ کر دیتے۔ بہرحال اب ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے فوراً رخصت ہو جاؤ اور پھر پندرہ دن کے اندر الموت سے واپس آؤ۔ لیکن اس طرح واپس آؤ کہ ہمارے بادشاہ کے نام ایک دوستانہ خط اور قیمتی تحائف تمہارے ساتھ ہوں۔ اس صورت میں بادشاہ تمہارے آقا سے خوشنود ہو جائیگا اور ہمیشہ کے لیے اس کی دوستی تمہیں حاصل ہو جائیگی" چنانچہ سفیر اس حکم کی تعمیل میں

فوراً رخصت ہو گئے اور ٹھیک پندرہ دن کے اندر شیخ کا دوستانہ خط اور قیمتی تحائف لے کر واپس ہوئے۔

ژو ابن ویل کی روایت کا یہ حصہ محلِ نظر ہے، اور عرب موّرخوں کی تصریحات اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ صلیبی جماعتیں اپنے عروج و اقتدار کے زمانے میں مجبور ہوئی تھیں کہ اپنی جانوں کی سلامتی کے لیے شیخ الجبال کو نذرانے بھیجتی رہیں، حتیٰ کہ فریڈرک ثانی نے بھی ضروری سمجھا تھا کہ اس طرح کی رسم و راہ قائم رکھے۔ پھر یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ۱۲۵۱ء میں جبکہ صلیبیوں کی تمام طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور فلسطین کے چند ساحلی مقامات میں ایک محصور و مقہور گروہ کی مایوس زندگی بسر کر رہے تھے، کیوں اچانک صورتِ حال منقلب ہو جائے اور شیخ الجبال ٹمپلروں سے خراج لینے کی جگہ خراج دینے پر مجبور ہو جائے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ ان تباہ حال ٹمپلروں سے اس درجہ خوف زدہ ہو کہ ان کے حاکمانہ احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کر دے؟

جو بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ٹمپلروں اور ہاسپٹلروں کے تعلقات شیخ الجبال سے قدیمی تھے، اور اس وابستگی کی وجہ سے ہر طرح کی ساز باز اس کے کارندوں کے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ شیخ الجبال نے جب لوئس کی آمد کا حال سُنا اور یہ بھی سنا کہ اس نے ایک گرانقدر فدیہ دے کر سلطانِ مصر کی

قید سے رہائی حاصل کی ہے، تو حسبِ معمول اُسے مرعوب کرنا چاہا اور اپنے سفیر قاتلانہ حملوں کے مرموز پیاموں کے ساتھ بھیجے۔ لوئس کو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹمپلروں سے شیخ کے پُرانے تعلقات ہیں۔ اُس نے معاملہ اُن کے سپرد کر دیا، اور انھوں نے بیچ میں پڑکر دونوں کے درمیان دوستانہ علاقہ قائم کرادیا۔ پھر طرفین سے تحفہ تحائف ایک دوسرے کو بھیجے گئے اور دوستانہ خط و کتابت جاری ہو گئی۔ عرب مورخوں کی تصریحات سے بھی صورتِ حال کا ایسا ہی نقشہ سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ الجبال اور صلیبیوں کے باہمی تعلقات اس درجہ بڑھے ہوئے تھے کہ صلیبیوں نے کئی بار اُس کے فدائیوں کے ذریعہ بعض سلاطین اسلام کو قتل کرانا چاہا تھا۔

لیکن پھر ژوا این ویل کے بیان کی کیا توجیہ کی جائے؟ معاملہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کہ ٹمپلروں نے حقیقتِ حال مخفی رکھی ہو، اور شیخ الجبال کے طرزِ عمل کی تبدیلی کو اپنے فرضی اقتدار و تحکم کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ اس لیے ژوا این ویل پر اصلیت نہ کھل سکی اور جو کچھ اس نے سُنا تھا، یادداشت میں لکھ دیا۔ یا پھر ماننا پڑیگا کہ خود ژوا این ویل کی دینی اور قومی عصبیت بیانِ حقیقت میں حائل ہو گئی اور اس نے صلیبیوں کا غیر معمولی تفوق اور اقتدار دکھانے کے لیے اصل واقعہ کو یکقلم اُلٹ دیا۔ ژوا این ویل نے صلیبیوں کی شکستوں کی سرگزشت جس بے لاگ صفائی کے

ساتھ قلمبند کی ہے، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے غالباً قرین صواب پہلی ہی صورت ہوگی۔

اس روایت کی کمزوری اس بات سے بھی نکلتی ہے کہ ٹمپلروں کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے سفیروں سے کہا۔ پندرہ دن کے اندر شیخ کا جواب لے کر واپس ہو۔ یعنی سات دن جانے میں صرف کرو۔ سات دن واپس آنے میں۔ یہ ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں عکہ اور التموت کی باہمی مسافت سات دن کے اندر طے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مستوفی نے نزہۃ القلوب میں اُس عہد کی منزلوں کا جو نقشہ کھینچا ہے، اُس سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ شمالی ایران کے قافلے بیت المقدس تک کی مسافت ایک ماہ سے کم میں طے نہیں کر سکتے تھے اور التموت تک پہنچنے کے لیے تو ایران سے بھی آگے کی مزید مسافت طے کرنی پڑتی ہوگی۔ ہاں برید یعنے گھوڑوں کی ڈاک کے ذریعہ کم مدت میں آمد و رفت ممکن ہوگی لیکن سفیروں کا برید کے ذریعہ سفر کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے

ژواین ویل لکھتا ہے کہ شیخ الجبال نے لوئس کو جو تحفے بھیجے تھے، ان میں بلور کا تراشا ہوا ایک ہاتھی اور ایک جی راف (Giraffe) یعنے زرّافہ بھی تھا۔ نیز بلور کے سیب اور شطرنج کے مُہرے تھے۔ یہ اُسی طرح کی بلوری مصنوعات ہونگی جن کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ التموت کا باغ بہشت ان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بلوری مصنوعات مغربی ایشیا میں پہلے چین سے آتی تھیں۔ پھر عرب صنّاع بھی بنانے لگے تھے۔

اس کے بعد اُس سفارت کا حال ملتا ہے جو لوئس نے شیخ الجبال کے پاس بھیجی تھی۔ اس سفارت میں بھی ہمارا پرانا دوست لابریتان بطور مترجم کے نمایاں ہوتا ہے اور اس کی زبانی شیخ کا ایک مکالمہ نقل کیا گیا ہے۔ لیکن پورا مکالمہ بعید از قیاس باتوں پر مبنی ہے اور قابل اعتنا نہیں۔ بعض حصے صریح بناوٹی معلوم ہوتے ہیں۔ یا سرتاسر غلط فہمیوں سے وجود پذیر ہوئے ہیں۔ مثلاً شیخ الجبال نے سینٹ پیٹر (پطرس) کی تقدیس کی اور کہا "ہابیل کی رُوح نوح میں آئی، نوح کے بعد ابراہیم میں، اور پھر ابراہیم سے پیٹر میں منتقل ہوئی۔ اُس وقت جبکہ "خدا زمین پر نازل ہوا تھا" (یعنے حضرت مسیح کا ظہور ہوا تھا!)

ممکن ہے شیخ نے یہ بات ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ حضرت مسیح کا منکر نہیں ہے یہ کہا ہو کہ جس وحی الٰہی کا ظہور پچھلے نبیوں میں ہوا تھا، اُسی کا ظہور حضرت مسیح میں ہوا، اور لابریتاں نے اسے دوسرا رنگ دے دیا۔

ژواین ویل شیعہ سنی اختلاف سے واقف ہے، لیکن اُس کی تشریح یوں کرتا ہے:-

"شیعہ محمدؐ کی شریعت پر نہیں چلتے۔ علی کی شریعت پر چلتے ہیں۔ علی محمدؐ کا چچا تھا۔ اسی نے محمدؐ کو عزت کی مسند پر بٹھایا لیکن جب محمدؐ نے قوم کی سرداری حاصل کر لی تو اپنے چچا کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا اور اس سے الگ ہو گیا۔ یہ حال

دیکھ کر علی نے کوشش کی کہ جتنے آدمی اپنے گرد جمع کر سکتا ہے جمع کرلے، اور پھر اُنہیں محمدؐ کے دین کے علاوہ ایک دوسرے دین کی تعلیم دے۔ چنانچہ اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ اب علی کی شریعت پر عامل ہیں، وہ محمدؐ کے ماننے والوں کو بے دین سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پیروانِ محمدؐ پیروانِ علی کو بے دین کہتے ہیں"

پھر لکھتا ہے: "جب لا بریتاں شیخ الجبال کے پاس گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ شیخ محمدؐ پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ علی کی شریعت ماننے والا ہے"

ژوائن ویل کا یہ بیان تمام تر اُن خیالات سے ماخوذ ہے جو اُس عہد کے کلیسائی حلقوں میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے، اور پھر صدیوں تک یورپ میں نسلاً بعد نسلٍ ان کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہ بیانات کتنے ہی غلط ہوں، تاہم اُن بیانات سے تو بہرحال غنیمت ہیں جو صلیبی حملہ کے ابتدائی دور میں ہر کلیسائی واعظ کی زبان پر تھے۔ مثلاً یہ بیان کہ "موہامت" (Mohamet) ایک سونے کا خوفناک بُت ہے۔ جس کی مسلمان پوجا کرتے ہیں۔ چنانچہ فرانسیسی اور تمیانی (اٹالین) زبان کے قدیم ڈراموں میں تروا گاں Tervagant اور Trivigante مسلمانوں کے ایک ہولناک بُت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ یہی لفظ قدیم انگریزی میں آکر ٹروے گینٹ Tervagant بن گیا، اور اب ٹرمے گینٹ Termagant ایسی عورت کے لیے بولنے لگے ہیں جو

وحشیانہ اور بے لگام مزاج رکھتی ہو۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شیخ الجبال کون تھا؟ یہ زمانہ تقریباً سنہ ۶۴۹ھ کا زمانہ تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد تاتاریوں کی طاقت مغربی ایشیا میں پھیلی، اور انھوں نے ہمیشہ کے لیے اس پراسرار مرکز کا خاتمہ کر دیا۔ پس غالباً یہ آخری شیخ الجبال خورشاہ ہوگا۔ یہاں کتابیں موجود نہیں اس لیے قطعی طور پر نہیں لکھ سکتا۔

صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرق وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اُس عہد کے مسیحی دماغ کی نمایندگی کرتا تھا، مشرق وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی، اور دونوں کی متقابل حالت سے ان کی متضاد نوعیتیں آشکارا ہوگئی تھیں۔ یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علم بردار تھا، مسلمان علم و دانش کے علم بردار تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا، مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا۔ مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سروسامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا۔ دوسرا روحانی اور مادی، دونوں کا۔ پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا۔ دوسرے نے نتائج عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے، لیکن نتائجِ عمل نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا!

ژوایں ویل کی سرگزشت میں بھی یہ متضاد تقابل ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب مصری فوج نے منجنیقوں (Petrarays) کے ذریعہ آگ کے بان پھینکنے شروع کیے تو فرانسیسی جن کے پاس پُرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، بالکل بے بس ہوگئے۔ ژوایں ویل اس سلسلہ میں لکھتا ہے:

"ایک رات جب ہم ان برجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں، پہرہ دے رہے تھے، تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن جسے پٹریری (یعنی منجنیق) کہتے ہیں، لاکر نصب کردیا اور اُس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر میرے لارڈ والٹر نے جو ایک اچھا نائٹ تھا، ہمیں یوں مخاطب کیا "اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آگیا ہے۔ کیونکہ اگر ہم نے اِن برجیوں کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں نے ان میں آگ لگادی تو ہم بھی برجیوں کے ساتھ جل کر خاک ہو جائینگے لیکن اگر ہم بُرجیوں کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں تو پھر ہماری بے عزتی میں کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ ہم ان کی حفاظت پر مامور کیے گئے تھے۔ ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کرسکے۔ میرا مشورہ آپ سب لوگوں کو یہ ہے کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں، ہمیں چاہیے کہ گھٹنے کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے" چنانچہ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کا پہلا بان چلا، ہم گھٹنوں کے بل جھک گئے

اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ بان اتنے بڑے ہوتے تھے، جیسے شراب کے پیپے، اور آگ کا شعلہ جو ان سے نکلتا تھا، اس کی دُم اتنی لمبی ہوتی تھی جیسے ایک بہت بڑا نیزہ۔ جب یہ آتا تو ایسی آواز نکلتی جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ اس کی شکل ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ایک آتشیں اژدہا ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اس کی روشنی نہایت تیز تھی۔ چھاؤنی کے تمام حصّے اس طرح اُجالے میں آ جاتے جیسے دن نکل آیا ہو"

اس کے بعد خود لوئس کی نسبت لکھتا ہے:۔

"ہر مرتبہ جب بان چھوٹنے کی آواز ہمارا ولی صفت پادشاہ سُنتا تھا، تو بستر سے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور روتے ہوئے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا۔ مہربان مولیٰ! میرے آدمیوں کی حفاظت کر! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے پادشاہ کی ان دعاؤں نے ہمیں ضرور فائدہ پہنچایا"

لیکن فائدہ کا یہ یقین خوش اعتقادانہ وہم سے زیادہ نہ تھا۔ کیونکہ بالآخر کوئی دعا بھی سودمند نہ ہوئی اور آگ کے بانوں نے تمام برجیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا!

یہ حال تو تیرھویں صدی مسیحی کا تھا، لیکن چند صدیوں کے بعد جب پھر یورپ اور مشرق کا مقابلہ ہوا، تو اب صورتِ حال یکسر اُلٹ چکی تھی۔ اب بھی دونوں جماعتوں کے متضاد خصائص اُسی طرح نمایاں تھے، جس طرح صلیبی جنگ

کے عہد میں رہے تھے، لیکن اتنی تبدیلی کے ساتھ کہ جو دماغی جگہ پہلے یورپ کی تھی، وہ اب مسلمانوں کی ہوگئی تھی، اور جو جگہ مسلمانوں کی تھی، اسے اب یورپ نے اختیار کرلیا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامع ازہر کے علماء کو جمع کرکے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ علماءِ ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کردینا چاہیے کہ انجاحِ مقاصد کے لیے تیر بہدف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کردیا! شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی نے اس عہد کے چشم دید حالات قلمبند کیے ہیں اور بڑے ہی عبرت انگیز ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیرِ بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ اُدھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں۔ اِدھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے "یا مقلب القلوب یا محوِّل الاحوال" کے نعرے بلند کررہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو۔ دوسری طرف ختم خواجگان!

دُعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر اُنہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل اور تعطلِ قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں!

ژواین ویل نے اس آتش فشانی کو "یونانی آگ" (Greek Fire) سے تعبیر کیا ہے اور اسی نام سے اس کی یورپ میں شہرت ہوئی۔ غالباً اس تسمیہ کی وجہ یہ تھی کہ جس مواد سے یہ آگ بھڑکتی تھی، وہ قسطنطینیہ میں صلیبیوں نے دیکھا تھا، اور اس لیے اسے یونانی آگ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

آتش فشانی کے لیے روغن نفط یعنے مٹی کا تیل کام میں لایا جاتا تھا۔ مٹی کے تیل کا یہ پہلا استعمال ہے جو عربوں نے کیا۔ آذربائجان کے تیل کے چشمے اُس زمانے میں بھی مشہور تھے۔ وہیں سے یہ تیل شام اور مصر میں لایا جاتا تھا۔ ابن فضل اللہ اور نویری نے اس کے استعمال کا مفصل حال لکھا ہے۔

آتش فشانی کے لیے دو طرح کی مشینیں کام میں لائی جاتی تھیں۔ ایک تو منجنیق کی قسم کی تھی جو پتھروں کے پھینکنے کے لیے ایجاد ہوئی تھی۔ دوسری، ایک طرح کا آلہ کمان کی شکل کا تھا اور توپ کی بیٹریوں کی طرح زمین میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی تھی۔ ژواین ویل نے پہلے کو Swivel Crossbow سے اور دوسرے کو Petary سے موسوم کیا ہے۔ "منجنیق" کا لفظ اُسی یونانی لفظ کی تعریب ہے جس سے انگریزی کا Mechanic فرانسیسی کا Mechanicus اور جرمن کا Mechanikas نکلا ہے۔ یہ آلہ عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے لیا تھا، لیکن دوسرا خود عربوں کی ایجاد تھا۔ چنانچہ اسے عربی میں "دفع" کہتے تھے۔

یعنے پھینکنے والا آلہ۔ یہی "مدفع" بعد کو توپ کے لیے بولا جانے لگا۔

عربی میں مٹی کے تیل کے لیے "نفط" کا لفظ مستعمل ہوا۔ یہی "نفط" ہے جس نے یورپ کی زبانوں میں Naphtha اور Naphthalene وغیرہا کی شکل اختیار کرلی ہے۔

ابوالکلام

قلعۂ احمد نگر
۱۷- دسمبر سنہ ۴۲ء

صدیق مکرم وقت وہی ہے مگر افسوس، وہ چائے نہیں ہے جو طبعِ شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے!

وہ چینی چائے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہوگئی، اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گرانمایہ سے آشنا نہیں:

یک نالۂ مستانہ زجائے نہ شنیدیم
ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ نہ دارد!

مجبوراً ہندوستان کی اُسی سیاہ پتّی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدے کے بموجب کہ:

برعکس نہند نام زنگی کافور!

لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں، اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا

کرتے ہیں:

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر
زیں رسم ہا کہ مردمِ عاقل نہادہ اند!

اس کارگاہ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلال صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا کہ دُردِ کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا، اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا۔ ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے۔ قدحے پُر نہ شد کہ تہی نہ کردند، و صفحہ تمام نہ شد کہ ورق بر نہ گردید:

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بہ کمال :: چوں صفحہ تمام شد ورق برگردد!

اُمید ہے، کہ آپ کی "عنبریں" چائے کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان میں آپ نے ذکر کیا تھا، اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہوگا:

اُمید کہ چوں بندہ تُنک مایہ نہ باشی
مے خوردنِ ہر روزہ ز عاداتِ کرام ست

معلوم نہیں، کبھی اس مسئلہ کے دقائق و معارف پر بھی آپ کی توجہ مبذول ہوئی ہے یا نہیں؟ اپنی حالت کیا بیان کروں؟ واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی طبیعت کبھی سوادِ اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہو سکی۔ زمانے کی بے راہ رویوں کا ہمیشہ ماتم گسار رہنا پڑا:

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتہ ست

چائے کے باب میں ابنائے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں کے معاملہ ہی میں نہیں ہوا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا۔ یعنے اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے!

سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں خود چائے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چائے کو چائے کے لیے پیتا ہوں۔ لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں۔ میرے لیے وہ مقاصد میں داخل ہوئی۔ اُن کے لیے وسائل میں۔ غور فرمائیے، میرا رُخ کس طرف ہے اور زمانہ کدھر جا رہا ہے؟

تو و طوبےٰ و ما و قامتِ یار   فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست!

چائے چین کی پیداوار ہے اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جا رہی ہے، لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں گزری کہ اس جوہرِ لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جا سکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہ راست گئی، مثلاً روس، ترکستان، ایران۔ وہاں بھی کسی کو یہ خیال نہیں گزرا۔ مگر سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی، اُنھوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد

کی، اور چونکہ ہندوستان میں چائے کا رواج انھی کے ذریعہ ہوا، اس لیے یہ بدعت سیئہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کی جگہ دودھ میں چائے ڈالنے لگے۔ بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود۔ ہر کہ آمد براں مزید کرد۔ اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے، لیکن ان کے تخمِ فساد نے جو برگ و بار پھیلا دیے ہیں، اُنھیں کون چھانٹ سکتا ہے؟ لوگ چائے کی جگہ ایک طرح کا سیال حلوا بناتے ہیں، کھانے کی جگہ پیتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چائے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ:

ہائے کمبخت، تو نے پی ہی نہیں!

پھر ایک بنیادی سوال چائے کی نوعیت کا بھی ہے، اور اس بارے میں بھی ایک عجیب عالمگیر غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ کس کس سے جھگڑیے، اور کس کس کو سمجھائیے:

روز و شب عربدہ با خلقِ خدا نتواں کرد

عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتّی کو جو ہندوستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے، سمجھتے ہیں، چائے ہے، اور پھر اُس کی مختلف قسمیں کر کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں اور اس ترجیح کے بارے میں باہم ردّ و کد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے، سیلون کی چائے بہتر ہے۔ دوسرا کہتا ہے،

دار جلنگ کی بہتر ہے۔ گویا یہ بھی وہ معاملہ ہوا کہ:

در رہِ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرم راز
ہر کسے بر حسب فہم گمانے دارد

حالانکہ ان فریب خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں، وہ سرے سے چائے ہے ہی نہیں:

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند!

دراصل یہ عالمگیر غلطی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ اُنھوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا، اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے، اُسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے:۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کمیاب ارزاں ہو، بے سمجھے بوجھے اسی پر ٹوٹ پڑی، اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی

پر اجماع کرلیا۔ اب آپ ہزار سر پیٹیے، سُنتا کون ہے:

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں!

معاملہ کا سب سے زیادہ درد انگیز پہلو یہ ہے کہ خود چین کے بعض ساحلی باشندے بھی اس عالمگیر فریب کی لپیٹ میں آگئے اور اسی پتّی کو چائے سمجھ کر پینے لگے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ بدخشانیوں نے لال پتھر کو لعل سمجھا، اور کشمیریوں نے رنگی ہوئی گھانس کو زعفران سمجھ کر اپنی دستاریں رنگنی شروع کردیں:

چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی!

نوعِ انسانی کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے جمعیت بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اِکّا دُکّا ہوگا۔ بھیڑ بےوقوفوں ہی کی رہیگی۔ ماننے پر آئینگے تو گائے کو خدا مان لینگے۔ انکار پر آئینگے تو مسیح کو سولی پر چڑھا دینگے۔ حکیم سنائی زندگی بھر ماتم کرتا رہا:

گاو را دارند باور در خدائی عامیاں

نوح را باور نہ دارند از پئے پیغمبری!

اسی لیے عرفاءِ طریق کو کہنا پڑا:

انکار بے خلق باش، تصدیق اینست مشغول بہ خویش باش توفیق اینست

تبعیتِ خلق از حق باطل کرد ترکِ تقلید گیر، تحقیق اینست

یہ تو اصول کی بحث ہوئی۔ اب فروع میں آیئے۔ یہاں بھی کوئی گوشہ نہیں

جہاں زمین ہموار ملے۔ سب سے اہم مسئلہ شکر کا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے بھی، اور نوعیت کے لحاظ سے بھی:

دردا کہ طبیب صبر می فرماید ویں نفسِ حریص را شکر می باید!

جہاں تک مقدار کا تعلق ہے، اسے میری محرومی سمجھیے یا تلخ کامی، کہ مجھے مٹھاس کے ذوق کا بہت کم حصہ ملا ہے۔ نہ صرف چائے میں بلکہ کسی چیز میں بھی زیادہ مٹھاس گوارا نہیں کر سکتا۔ دنیا کے لیے جو چیز مٹھاس ہوئی، وہی میرے لیے بدمزگی ہو گئی۔ کھاتا ہوں تو منہ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ لوگوں کو جو لذت مٹھاس میں ملتی ہے، مجھے نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک پڑا ہو گا مگر میں اوپر سے اور چھڑک دونگا۔ میں صباحت کا نہیں، ملاحت کا قتیل ہوں:

وللناس فِی ما یعشقون مذاھب!

گویا کہہ سکتا ہوں کہ "اخی یوسف اصبح وانا املح منہ" کے مقام کا لذت شناس ہوں:

گر نکتہ دانِ عشقی، خوش بشنو ایں حکایت!

اس حدیث کے تذکرہ نے یارانِ قصص و مواعظ کی وہ خانہ ساز روایت یاد دلا دی کہ "الایمان حلوۃ والمومن یحب الحلوی" لیکن اگر مدارج ایمانی کے حصول اور مراتبِ ایقانی کی تکمیل کا یہی معیار ٹھہرا، تو نہیں معلوم، اُن تہی دستانِ نقدِ حلاوت کا کیا حشر ہونے والا ہے جن کی محبتِ حلاوت کی ساری پونجی چائے کی چند پیالیوں سے زیادہ نہیں ہوئی، اور اُن میں بھی کم شکر پڑی ہوئی۔ اور پھر اُس کم شکر پر بھی تاسف

کہ نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ ہاں، مولانا شبلی مرحوم کا بہترین شعر یاد آ گیا:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم!

بچوں کا مٹھاس کا شوق ضرب المثل ہے، مگر آپ کو سُن کر تعجب ہو گا کہ میں بچپنے میں بھی مٹھاس کا شائق نہ تھا۔ میرے ساتھی مجھے چھیڑا کرتے تھے کہ تجھے نیم کی پتیاں چبانی چاہئیں، اور ایک مرتبہ پسی ہوئی پتیاں کھلا بھی دی تھیں:

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیِ دوراں سے!

میں نے یہ دیکھ کر کہ مٹھاس کا شائق نہ ہونا نقص سمجھا جاتا ہے، کئی بار بہ تکلف کوشش کی کہ اپنے آپ کو شائق بنا دوں، مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ گویا وہی بات ہوئی

مرادے ست بہ کفر آشنا، کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم!

بہر حال یہ تو شکر کی مقدار کا مسئلہ تھا، مگر معاملہ اس پر ختم کہاں ہوتا ہے؟

کوتہ نظر ببیں کہ سخن مختصر گرفت!

ایک دقیق سوال اُس کی نوعیت کا بھی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جو شکر

ہر چیز میں ڈالی جاسکتی ہے، وہی چائے میں بھی ڈالنی چاہیے۔ اس کے لیے کسی خاص شکر کا اہتمام ضروری نہیں۔ چنانچہ باریک دانوں کی دوبارہ شکر جو پہلے جاوا اور موریشس سے آتی تھی اور اب ہندوستان میں بننے لگی ہے، چائے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ حالانکہ چائے کا معاملہ دوسری چیزوں سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ اسے حلوے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا مزاج اس قدر لطیف اور بے میل ہے کہ کوئی چیز بھی جو خود اسی کی طرح صاف اور لطیف نہ ہوگی فوراً اُسے مکدر کر دیگی۔ گویا چائے کا معاملہ بھی وہی ہوا کہ:

نسیمِ صبح جو چھو جائے، رنگ ہو میلا!

یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کیے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے، صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جونہی اسے چائے میں ڈالیے، معاً اُس کا ذائقہ متاثر اور لطافت آلودہ ہو جائیگی۔ اگرچہ یہ اثر ہر حال میں پڑتا ہے، تاہم دودھ کے ساتھ پیجیے تو چنداں محسوس نہیں ہوتا کیونکہ دودھ کے ذائقہ کی گرانی چائے کے ذائقہ پر غالب آجاتی ہے اور کام چل جاتا ہے لیکن سادہ چائے پیجیے تو فوراً بول اُٹھیگی۔ اس کے لیے ایسی شکر چاہیے جو بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو۔ ایسی شکر ڈلیوں کی شکل میں بھی آتی ہے اور بڑے دانوں کی شکل میں بھی۔ میں ہمیشہ بڑے دانوں کی شفاف شکر کام میں لاتا ہوں، اور

اس سے وہ کام لیتا ہوں جو مرزا غالب گلاب سے لیا کرتے تھے:

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوئے اوست

آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

میرے لیے شکر کی نوعیت کا یہ فرق ویسا ہی محسوس اور نمایاں ہوا، جیسے شربت پینے والوں کے لیے قند اور گڑ کا فرق ہوا لیکن یہ عجیب مصیبت ہے کہ دوسروں کو کسی طرح بھی محسوس نہیں کرا سکتا۔ جس کسی سے کہا، اس نے یا تو اسے مبالغہ پر محمول کیا، یا میرا وہم و تخیل سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو میرے ہی مُنہ کا مزہ بگڑ گیا ہے، یا دنیا میں کسی کے مُنہ کا مزہ درست نہیں۔ یہ نہ بھولیے کہ بحث چائے کے تکلفات میں نہیں ہے۔ اُس کی لطافت و کیفیت کے ذوق و احساس میں ہے۔ بہت سے لوگ چائے کے لیے صاف ڈلیاں اور موٹی شکر استعمال کرتے ہیں، اور یورپ میں تو زیادہ تر ڈلیوں ہی کا رواج ہے، مگر یہ اس لیے نہیں کیا جاتا کہ چائے کے ذائقہ کے لیے یہ کوئی ضروری چیز ہوئی، بلکہ محض تکلف کے خیال سے کیونکہ اس طرح کی شکر نسبتہً قیمتی ہوتی ہے۔ آپ انہیں معمولی شکر ڈال کر چائے دے دیجیے۔ بے غل و غش پی جائینگے اور ذائقہ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرینگے۔

شکر کے معاملہ میں اگر کسی گروہ کو حقیقت آشنا پایا تو وہ ایرانی ہیں۔ اگرچہ چائے کی نوعیت کے بارے میں چنداں ذی حس نہیں مگر یہ نکتہ اُنہوں نے پا لیا

ہے۔ عراق اور ایران میں عام طور پر یہ بات نظر آئی تھی کہ چائے کے لیے قند کی جستجو میں رہتے تھے اور اسے معمولی شکر پر ترجیح دیتے تھے، کیونکہ قند صاف ہوتی ہے، اور وہی کام دیتی ہے جو موٹے دانوں کی شکر سے لیا جاتا ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اب وہاں کا کیا حال ہے۔

اور اگر "تعرف الاشیاء باضدادہا" کی بناپر پوچھیے کہ چائے کے معاملہ میں سب سے زیادہ خیرہ مذاق گروہ کون ہوا؟ تو میں بلا تامل انگریزوں کا نام لونگا یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چائے انگلستان کی راہ سے گئی اور دنیا میں اس کا عالمگیر رواج بھی بہت کچھ انگریزوں ہی کا منت پذیر ہے، تاہم یہ نزدیکانِ بے بصر حقیقتِ حال سے اتنے دور جا پڑے کہ چائے کی حقیقی لطافت و کیفیت کا ذوق انہیں چھو بھی نہیں گیا۔ جب اس راہ کے اماموں کا یہ حال ہے، تو ان کے مقلدوں کا جو حال ہوگا، معلوم ہے:

آشنا را حال این ست، وائے بر بیگانہ!

انہوں نے چین سے چائے پینا تو سیکھ لیا مگر اور کچھ سیکھ نہ سکے۔ اول تو ہندستان اور سیلون کی سیاہ پتی ان کے ذوقِ چائے نوشی کا منتہاءِ کمال ہوا۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اُس میں بھی ٹھنڈا دودھ ڈال کر اسے یک قلم گندہ کر دینگے۔ مزید ستم ظریفی دیکھیے کہ اس گندے مشروب کی معیار سنجیوں کے لیے ماہرینِ فن کی ایک پوری فوج موجود رہتی ہے۔ کوئی ان زیاں کاروں سے پوچھے کہ اگر چائے نوشی سے

مقصود انہی پتیوں کو گرم پانی میں ڈال کر پی لینا ہی، تو اس کے لیے ماہرینِ فن کی دقیقہ سنجیوں کی کیا ضرورت ہے؟ جو پتّی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے اور ایک تیز بو پیدا ہو جائے، چائے ہے، اور اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے۔ چائے کا ایک ماہرِ فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک بتلائیگا؟

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی، اور کیا کہنے کو ہیں؟

اگرچہ فرانس اور برِاعظم میں زیادہ تر رواج کافی کا ہوا، تاہم اعلیٰ طبقہ کے لوگ چائے کا بھی شوق رکھتے ہیں، اور اُن کا ذوق بہرحال انگریزوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ زیادہ تر چینی چائے پیئینگے، اور اگر سیاہ چائے پیئینگے بھی تو اکثر حالتوں میں بغیر دودھ کے یا لیموں کی ایک قاش کے ساتھ جو چائے کی لطافت کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ اَور نکھار دیتی ہے۔ یہ لیموں کی ترکیب دراصل روس، ترکستان، اور ایران سے چلی۔ سمرقند اور بخارا میں عام دستور ہے کہ چائے کا تیسرا فنجان لیمونی ہوگا۔ بعض ایرانی بھی دور کا خاتمہ لیمونی ہی پر کرتے ہیں۔ یہ کمبخت دودھ کی آفت تو صرف انگریزوں کی لائی ہوئی ہے؛

سرِ ایں فتنہ زجائیست کہ من می دانم!

اب اِدھر اِک اَور نئی مصیبت پیش آگئی ہے۔ اب تک تو صرف شکر کی

عام قسم ہی کے استعمال کا رونا تھا لیکن اب معاملہ صاف صاف گڑ تک پہنچنے والا ہے۔ ہندوستان قدیم میں جب لوگوں نے گڑ کی منزل سے قدم آگے بڑھانا چاہا تھا تو یہ کیا تھا کہ گڑ کو کسی قدر صاف کر کے لال شکر بنانے لگے تھے۔ یہ صفائی میں سفید شکر سے منزلوں دور تھی مگر ناصاف گڑ سے ایک قدم آگے نکل آئی تھی۔ پھر جب سفید شکر عام طور پر بننے لگی تو اس کا استعمال زیادہ تر دیہاتوں میں محدود رہ گیا۔ لیکن اب پھر دنیا اپنی ترقی معکوس میں اُسی طرف لوٹ رہی ہے جہاں سے سیکڑوں برس پہلے آگے بڑھی تھی۔ چنانچہ آج کل امریکہ میں اس لال شکر کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں کے اہل ذوق کہتے ہیں۔ کافی بغیر اس شکر کے مزہ نہیں دیتی، اور جیسا کہ قاعدہ مقررہ ہے، اب ان کی تقلید میں یہاں کے اصحابِ ذوق بھی "براؤن شوگر" کی صدائیں بلند کرنے لگے ہیں۔ میری یہ پیشین گوئی لکھ رکھیے کہ عنقریب یہ براؤن شکر کا ہلکا سا پردہ بھی اُٹھ جائیگا اور صاف صاف گڑ کی مانگ ہر طرف شروع ہو جائیگی۔ یارانِ ذوقِ جدید کہینگے کہ گڑ کے ڈلے ڈالے بغیر نہ چائے مزہ دیتی ہے نہ کافی۔ فرمائیے، اب اس کے بعد کیا باقی رہ گیا ہے جس کا انتظار کیا جائے؟

وائے گر درپسِ امروز بود فردائے!

شکر اور گڑ کی دنیائیں اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئی ہیں کہ آدمی ایک کا ہو کر پھر دوسرے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن

لوگوں نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی گڑ کھا لیا، شکر کی لطافت کا احساس پھر ان میں باقی نہیں رہا۔ جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں، اس لیے گڑ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لیے اس درجہ نمایاں ہے، اُنھیں بھی محسوس کراؤں، لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کے رہ گیا۔

بہر حال زمانہ کی حقیقت فراموشیوں پر کہاں تک ماتم کیا جائے:

کوتہ نہ تواں کرد کہ ایں قصہ دراز ست!

آئیے، آپ کو کچھ اپنا حال سُناؤں۔ اصحاب نظر کا قول ہے کہ حُسن اور فن کے معاملہ میں حب الوطنی کے جذبہ کو دخل نہیں دینا چاہیے:

متاع نیک، ہر دکان کہ باشد

پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں بھی چائے کے باب میں شاہدانِ ہند کا نہیں، خوبانِ چین کا معتقد ہوں:

دوائے دردِ دلِ خود ازاں مفرح جوئے

کہ در صراحی چینی و شیشۂ حلبی ست!

میرے جغرافیہ میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ جنرل چنگ کائی شک اور میڈم چنگ وہاں سے آئے تھے، بلکہ اس لیے کہ چائے وہیں سے آتی ہے:-

مئے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار
ما نہ دانیم کہ بسطامے و بغدادے ہست!

ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں، وہ وہائٹ جیسمین (White Jasmine) کہلاتی ہے۔ یعنے "یاسمن سفید" یا ٹھیٹ اُردو میں یوں کہیے کہ "گوری چنبیلی":

کسیکہ محرم راز صبا ست، می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی ست!

اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اُتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے آتش سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے:

مے میانِ شیشۂ ساقی نگر
آتشے گویا بہ آب آلودہ اند!

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چائے کی علویت کچھ اَور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے، جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں۔ ملا محمد مازندرانی صاحب بت خانہ نے اگر یہ چائے پی ہوتی تو خانخاناں کی خانہ ساز شراب کی مدح میں ہرگز یہ نہ کہتا:

ز می ماند ایں بادہ اصلا بہ آب تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب!

لڑائی کی وجہ سے جہازوں کی آمد و رفت بند ہوئی تو اس کا اثر چائے پر بھی پڑا۔ میں کلکتہ کے جس چینی اسٹور سے منگوایا کرتا تھا، اس کا ذخیرہ جواب دینے لگا تھا۔ پھر بھی چند ڈبے مل گئے تھے، اور بعض چینی دوستوں نے بطور تحفہ کے بھی بھیج کر چارہ سازی کی تھی۔ جب کلکتہ سے نکلا تو ایک ڈبّا ساتھ تھا۔ ایک گھر میں چھوڑ آیا تھا۔ بمبئے سے گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تو سامان کے ساتھ وہ بھی آگیا، اور پھر قبل اس کے کہ ختم ہو، گھر والا ڈبّا بھی پہنچ گیا۔ اس طرح یہاں اور چیزوں کی کتنی ہی کمی محسوس ہوئی ہو، لیکن چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی، اور اگر چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی۔

حافظ دگر چہ می طلبی از نعیم دہر؟
مے می خوری و طرّۂ دلدار می کشی!

اس کی فکر کبھی نہیں ہوئی کہ یہ آخری ڈبّا چلیگا کب تک؟ کیونکہ خواجۂ شیراز کی موعظت ہمیشہ پیشِ نظر رہتی ہے:

تا ساغرت پُر ست، بنوشان و نوش کن!

یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلہ میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دور واقع ہوئی ہے؟ عمریں گزر جائیں پھر بھی یہ مسافت طے نہیں

ہو سکتی۔ کہاں چائے کے ذوقِ لطیف کا شہرستانِ کیف و سرور، اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری!

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں؟

جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پینے بھی ہیں خواصِ یورپ کی ہم مشربی کے ذوق ہیں بغیر دودھ کی لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے، شاہراہ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور اپنی پیچو پیچو ہی کی قسموں پر قانع رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اِن حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا نہ صرف بے سود تھا، بلکہ "وضع الشیٔ فی غیر محلہٖ" کے حکم میں داخل تھا:

مے بہ زہاد مکن عرضہ کہ این جوہرِ ناب
پیشِ ایں قوم بہ شوربائے زمزم نہ رسد

اِن حضرات میں صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنہوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا تھا، کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے مگر اچھی ہے۔ یعنے بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہوا جو وہ روز پیا کرتے ہیں، مگر یہ بھی چنداں بُری نہیں۔ زمانے کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے یہ ان کی صرف "اچھی ہے" کی داد بھی مجھے اتنی غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی اُنہیں

بُلا لیا کرتا تھا کہ آیئے، ایک پیالی اس "اچھی ہے" کی بھی پی لیجیے:

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت ست!

ان کے لیے یہ صرف "اچھی" ہوئی۔ یہاں چائے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے اگر یہ "اچھی ہے" ختم ہو جائے۔ غالبؔ کیا خوب کہہ گیا ہے:۔

زاہد از ما خوشۂ تا کے بہ چشمِ کم مبیں

ہیں، نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم!

مگر ایک ڈبا کب تک کام دے سکتا تھا؟ آخر ختم ہونے پر آیا۔ چیتہ خاں نے یہاں دریافت کرایا۔ پونا بھی لکھا۔ لیکن اس قسم کی چائے کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔ اب بمبئے اور کلکتہ لکھوایا ہے۔ دیکھیے، کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک ہفتہ سے دہی ہندوستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی اُمیدوں پر جی رہا ہوں:

نہ کنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را

اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل!

آج کل چینی ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر جگہ چینی رسٹوراں کھل گئے ہیں۔ چونکہ احمد نگر انگریزی فوج کی بڑی چھاؤنی ہے، اس لیے یہاں بھی ایک چینی رسٹوراں کھُل گیا ہے۔ جیلر کو خیال ہوا کہ ان لوگوں کے پاس یہ چائے ضرور ہوگی۔ اُس نے خالی ڈبا بھیج کر دریافت کرایا۔ اُنہوں نے ڈبا دیکھتے ہی کہا کہ یہ چائے اب کہاں مل سکتی ہے؟ لیکن تمہیں یہ ڈبا کہاں سے ملا؟ اور

اس چائے کی یہاں ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی یہاں آرہا ہے؟ جو وارڈر بازار گیا تھا اُس نے ہر چند باتیں بنائیں مگر اُن کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چیانگ کائی شک قلعہ کے قیدیوں سے ملنے آرہی ہے، اور اس کے لیے چینی چائے کا اہتمام کیا جا رہا ہے!

بہ بیں کہ نقشِ الہٰا چہ باطل افتادست!

چائے کے ڈبے کی تہہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پتیوں کا چُورا بیٹھ جایا کرتا ہے اور اُسے ڈبے کے ساتھ پھینک دیا کرتے ہیں۔ یہ آخری ڈبا ختم ہونے پر آیا تو تھوڑا سا چُورا اس کی تہہ میں بھی جمع تھا۔ میں نے چھوڑ دیا کہ اسے کیا کام میں لاؤں لیکن چیتہ خاں نے دیکھا تو کہا، آج کل لڑائی کی وجہ سے "ضائع مت کرو" کا نعرہ زبانوں پر ہے۔ یہ چُورا بھی کیوں نہ کام میں لایا جائے؟ میں نے بھی سوچا کہ:

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست، دم درکش
کہ ہر چہ ساقیِ ما ریخت عینِ الطاف ست

چنانچہ یہ چُورا بھی کام میں لایا گیا، اور اُس کا ایک ایک ذرّہ دم دے کر پیتا رہا۔ جب فنجان میں چائے ڈالتا تھا، تو ان ذرّوں کی زبانِ حال پکارتی تھی:

ہر چند کہ نیست رنگ و بوئم آخر نہ گیاہِ باغِ ادیم!

اس تخیل نے کہ ان ذرّوں کے ہاتھ سے کیف و سرور کا جام لے رہا ہوں، توسنِ فکر کی جولانیوں کے لیے تازیانہ کا کام دیا، اور اچانک ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا

دیا۔ ہا، مرزا بیدل نے میری زبانی کہا تھا:

اگر دماغم دریں شبستاں خمارِ شرمِ عدم نہ گیرد
زچشمکِ ذرہ جام گیرم بہ آں شکوہے کہ جم نہ گیرد!

دریں قلمرو کفِ غبارم، بہ ہیچ کس ہمسری نہ دارم
کمالِ میزانِ اعتبارم بس ست گر ذرہ کم نہ گیرد!

اس تجربے کے بعد بے اختیار خیال آیا کہ اگر ہم تشنہ کاموں کی قسمت میں اب سرجوشِ خُم کی کیفیتیں نہیں رہی ہیں، تو کاش، اس تہہ شیشۂ ناصاف ہی کے چند گھونٹ مِل جایا کریں۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
یوں ہے کہ مجھے دُردِ تہہِ جام بہت ہے!

شکر کے مسئلہ نے بھی یہاں آتے ہی سر اُٹھایا تھا، مگر مجھے فوراً اس کا حل مِل گیا، اور اب اس طرف سے مطمئن ہوں۔ موٹے دانوں کی صاف شکر تھوڑی سی میرے سفری سامان میں تھی جو کچھ دنوں تک چلتی رہی۔ جب ختم ہو گئی تو میں نے خیال کیا کہ یہاں ضرور مِل جائیگی۔ نہیں ملی تو ڈلیوں کے بکس تو ضرور مل جائینگے لیکن جب بازار میں دریافت کرایا تو معلوم ہوا، امن کے وقتوں میں بھی یہاں ان چیزوں کی مانگ نہ تھی، اور اب کہ جنگ کی رُکاوٹوں نے راہیں روک دی ہیں ان کا سُراغ کہاں مل سکتا ہے؟ مجبوراً مصری منگوائی اور چاہا کہ اُسے

گُڑ اور شکر کی طرح کام میں لاؤں۔ لیکن کوٹنے کے لیے ہاون کی ضرورت ہوئی۔ جیلر سے کہا، ایک ہاون اور ہاون دستہ منگوا دیا جائے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہاں نہ ہاون ملتا ہے نہ دستہ۔ حیران رہ گیا کہ کیا اس بستی میں کبھی کسی کو اپنا سر پھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ آخر لوگ زندگی کیسے بسر کرتے ہیں؟

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر
بہ سر نہ کوفتہ باشد درِ سرائے را!

مجبوراً میں نے ایک دوسری ترکیب نکالی۔ ایک صاف کپڑے میں مصری کی ڈلیاں رکھیں، اور بہت سارے ردّی کاغذ اوپر تلے دھر دیا، پھر ایک پتھر اُٹھا کر ایک قیدی کے حوالہ کیا، جو یہاں کام کاج کے لیے لایا گیا ہے، کہ اپنے سر کی جگہ اِسے پیٹ:

دریں کہ کوہکن از ذوق، داد جاں چہ سخن؟
ہمیں کہ تیشہ بہ سر دیر زد، سخن باقی ست!

لیکن یہ گرفتارِ آلات و وسائل بھی کچھ ایسا:

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا!

کہ ایک چوٹ بھی قرینہ کی نہ لگا سکا۔ مصری تو کُٹنے سے رہی۔ البتہ کاغذ کے پرزے پرزے اُڑ گئے، اور کپڑے نے بھی اُس کے روئے صبیح کا نقاب بننے سے انکار کر دیا:

چلی بھی برچھی کسی پر، کسی کے آن لگی!

بہر حال کئی دنوں کے بعد خدا خدا کر کے ہاون کا چہرۂ زشت نظر آیا۔ "زشت" اس لیے کہتا ہوں کہ کبھی ایسا انگھڑ ظرف نظر سے نہیں گزرا تھا۔ آج کل ٹاٹا نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ خبر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے وسط ہند کے ایک قبیلہ نے ملک کو لوہے اور لوہاری کی صنعت سے آشنا کیا تھا۔ عجب نہیں یہ ہاون بھی اُسی قبیلہ کی دست کاریوں کا بقیہ ہو، اور اس انتظار میں گردشِ لیل و نہار کے دن گنتا رہا ہو کہ کب قلعہ احمد نگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہنچتا ہے، اور کب ایسا ہوتا ہے کہ اُنہیں سر پھوڑنے کے لیے تیشہ کی جگہ ہاون دستہ کی ضرورت پیش آتی ہے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں!

خیر کچھ ہو، مصری کوٹنے کی راہ نکل آئی۔ لیکن اب کُٹی ہوئی مصری موجود ہے، تو وہ چیز موجود نہیں جس میں مصری ڈالی جائے:

اگر دستے کنم پیدا، نمی یابم گریباں را!

دیکھیے، صرف اتنی بات کہنی چاہتا تھا کہ چائے ختم ہو گئی، مگر بائیس صفحے تمام ہو چکے اور ابھی تک بات تمام نہیں ہوئی:

یک حرف بیش نیست سراسر حدیثِ شوق
ایں طرفہ تر کہ ہیچ بہ پایاں نمی رسد!

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۷- جنوری سنہ ۴۳ء

صدیق مکرم وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ سردی اپنے پورے عروج پر ہے۔ کمرہ کا دروازہ اور کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہے۔ ہوا کے برفانی جھونکے دمبدم آرہے ہیں۔ چائے دم دے کے ابھی ابھی رکھی ہے۔ منتظر بیٹھا ہوں کہ پانچ چھ منٹ گزر جائیں اور رنگ و کیف اپنے معیاری درجہ پر آجائے تو دور شروع کروں۔ دو مرتبہ نگاہ گھڑی کی طرف اٹھ چکی ہے مگر پانچ منٹ ہیں کہ کسی طرح ہونے پر نہیں آتے۔ خواجۂ شیراز کا ترانۂ صبح گاہی دل و دماغ میں گونج رہا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گنگناؤں مگر ہمسایوں کی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ لبوں کو کھلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ناچار نوک قلم کے حوالہ کرتا ہوں:

صبح ست و ژالہ می چکد از ابرِ بہمنی — برگِ صبوح سازو بزن جام یک منی

گر صبحدم خمار ترا دردِ سر دہد — پیشانی خمار ہماں بہ کہ بشکنی!

ساقی، بہوش باش، کہ غم در کمین ماست — مطرب، نگاہدار ہمیں رہ کہ می زنی!

ساقی، بہ بے نیازی یزداں کہ می بیار — تا بشنوی ز صوتِ مغنّی "ہو الغنی"!

اس علاقہ میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں، کبھی اس طرف بھی آپ کا گزر ہوا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوا ہے تو کس موسم میں؟ لیکن پونا

تو آپ بارہا گئے ہونگے۔ ڈسمبر ۱۹۱۵ء کا سفر مجھے بھی یاد ہے جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقعہ پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی۔ پونا یہاں سے صرف اسی میل کی مسافت پر واقع ہے اور دکن کا یہ تمام حصہ ایک ہی سطح مرتفع ہے۔ اس لیے یہاں کی موسمی حالت کو پونا پر قیاس کر لیجیے۔ علاوہ بریں وقت کے زندانی، کچھ پونا میں رکھے گئے ہیں، کچھ یہاں، اس لیے ویسے بھی اہل قیاس کے نزدیک، بقول عرفی دونوں کا حکم ایک ہی ہوا:

یکے ست نسبتِ شیرازی و بدخشانی!

فیضی کو جب اکبر نے سفارت پر یہاں بھیجا تھا تو معاملات کی پیچیدگیوں نے اسے دو سال تک ہلنے نہیں دیا اور یہاں کے ہر موسم کے تجربے کا موقعہ ملا۔ اس نے اپنے مکاتیب میں احمد نگر کی آب و ہوا کے اعتدال کی بہت تعریف کی تھی۔ فیضی سے بہت پہلے کا یہ واقعہ ہے کہ ملک التجار شیرازی نے مولانا جامی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ اس ملک میں بارہ مہینے ہوائے معتدل کا لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔ خیر، بارہ مہینا کہنا تو صریح مبالغہ تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ یہاں گرمی کے دن بہت کم ہوتے ہیں اور یہاں کی برسات مالوہ کی برسات کی طرح بہت ہی پُر لطف ہوتی ہے۔ غالباً ۱۹۰۵ء کی بات ہے کہ بمبئی میں مرزا فرصت شیرازی صاحب آثار العجم سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ برسات کا موسم پونا میں بسر کر کے لوٹے

تھے اور کہتے تھے، پونا کی ہوا کے اعتدال نے ہوائے شیراز کی یاد تازہ کردی:

اے گُل بتو خرسندم، تو بوئے کسے داری!

میرا ذاتی تجربہ معاملہ کو یہاں تک نہیں لے جاتا۔ لیکن بہرحال میں شیراز میں مسافر تھا، اور مرزائے موصوف صاحبُ البیت تھے۔ وصاحب البیت ادری بمافیہا!

اورنگ زیب جب دکن آیا تھا تو یہاں کے برشگال کا اعتدال اس کی طبع خشک کو بھی تر کیے بغیر نہ رہا تھا۔ آپ نے تاریخ خوافی خاں اور مآثر الامراء وغیرہ میں جا بجا پڑھا ہوگا کہ برسات کا موسم اکثر احمد نگر یا پونا میں بسر کرتا تھا۔ پونا کا نام اُس نے "محی نگر" رکھا تھا مگر زبانوں پر نہیں چڑھا۔ اس کا انتقال احمد نگر ہی میں ہوا تھا۔

جہاں تک اس اعتدال کا تعلق گرمی اور برسات کے موسم سے ہے، اس کے حسن و خوبی میں کلام نہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا سردی کا موسم بھی معتدل ہوتا ہے۔ حالانکہ سردی کا موسم ایک ایسا موسم ہوا کہ اس میں جس قدر بھی زیادتی ہو، موسم کا حسن اور زندگی کا عیش ہے۔ اس کی کمی نقص و فتور کا حکم رکھتی ہے۔ اسے اعتدال کہہ کر سراہا نہیں جا سکتا:

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر

زیں رسمہا کہ مردم عاقل نہادہ اند!

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اوائل عمر سے میری طبیعت کا اس بارے میں کچھ عجیب حال رہا ہے۔ گرمی کتنی ہی معتدل ہو، مگر مجھے بہت جلد پریشان کر دیتی ہے، اور ہمیشہ سرد موسم کا خواستگار رہتا ہوں۔ موسم کی خنکی میرے لیے زندگی کا اصلی سرمایہ ہے، یہ پونجی ختم ہوئی اور گویا زندگی کی ساری کیفیتیں ختم ہو گئیں۔ چونکہ زندگی بہر حال بسر کرنی ہے، اس لیے کوشش کرتا رہتا ہوں کہ ہر موسم سے سازگار رہوں لیکن طبیعت کے اصلی تقاضہ پر غالب نہیں آسکتا۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کا موسم سرما اس درجہ تنک مایہ ہے کہ ابھی آیا نہیں کہ جانا شروع کر دیتا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔ میری طبع سراسیمہ کے لیے اس صورت حال میں صبر و شکیب کی ایک عجیب آزمائش پیدا ہو گئی ہے۔ جب تک وہ آتا نہیں، اس کے انتظار میں دن کاٹتا ہوں۔ جب آتا ہے تو اُس کی آمد کی خوشیوں میں محو ہو جاتا ہوں، لیکن اس کا قیام اتنا مختصر ہوتا ہے کہ ابھی اس کی پذیرائیوں کے سروبرگ سے فارغ نہیں ہوا کہ اچانک ہجران و وداع کا ماتم سر پر آکھڑا ہوتا ہے:

ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت!

میں آپ کو بتلاؤں۔ میرے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہو سکتا ہے؟ جاڑے کا موسم ہو اور جاڑا بھی قریب قریب درجہ انجماد کا۔ رات کا وقت ہو، آتشدان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور میں کمرے کی ساری

مسند میں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے یا لکھنے میں مشغول ہوں:

من ایں مقام بدُنیا و عاقبت نہ دہم
اگرچہ درپیم اُفتند خلق انجمنے!

معلوم نہیں بہشت کے موسم کا کیا حال ہوگا؟ وہاں کی نہروں کا ذکر بہت سُننے میں آیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں گرمی کا موسم نہ رہتا ہو:

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے، وہ تری جلوہ گاہ ہو!

عجیب معاملہ ہے۔ میں نے بارہا غور کیا کہ میرے تصور میں آتشدان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے؟ لیکن کچھ بتلا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتشدان کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہوا۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا اگر آتشدان نہ سُلگ رہا ہو۔ پھر آتشدان بھی وہی پُرانی روش کا ہونا چاہیے جس میں لکڑیوں کے بڑے بڑے کُندے جلائے جا سکیں۔ بجلی کے ہیٹر سے میری تسکین نہیں ہوتی۔ بلکہ اسے دیکھ کر طبیعت چڑ سی جاتی ہے۔ ہاں گیس کے آتشدان کی ترکیب اُتنی بے معنی محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ پتھر کے ٹکڑے رکھ کر انگاروں کے ڈھیر کی سی شکل بنا دیتے ہیں، اور اس کے پیچھے سے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ کم از کم شعلوں کی نوعیت باقی رہتی ہے۔ پھر بھی ہم اُسے ترجیح دینے کے لیے تیار

نہیں۔ دراصل میں صرف گرمی ہی کے لیے آتشدان کا شیدائی نہیں ہوں۔ مجھے شعلوں کا منظر چاہیے۔ جب تک شعلے بھڑکتے نظر نہ آئیں، دل کی پیاس بجھتی نہیں۔ بے دردوں کو جو دل کی جگہ برف کی سل سینہ میں چھپائے پھرتے ہیں، ان معاملات کی کیا خبر؟

سینۂ گرم نہ داری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات عود مخر!

آپ سن کر ہنسینگے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس خیال سے کہ سردی کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کروں جنوری کی راتوں میں آسمان کے نیچے بیٹھ کر صبح کی چائے پیتا رہا، اور اپنے آپ کو اس دھوکے میں ڈالتا رہا کہ آج سردی خوب پڑ رہی ہے:

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم!

میری طبیعت کا بھی عجیب حال ہے۔ دوسروں سے پہلے خود اپنی حالت پر ہنستا ہوں۔ بچپنے میں چند مہینے چنسورہ میں بسر کیے تھے کیونکہ کلکتہ میں طاعون پھیل رہا تھا۔ یہ جگہ عین دریائے ہوگلی پر واقع ہے۔ میں نے یہیں سب سے پہلے تیرنا سیکھا۔ صبح و شام گھنٹوں دریا میں تیرتا رہتا۔ پھر بھی جی سیر نہ ہوتا۔ اب بھی تیراکی کے لیے طبیعت ہمیشہ ترستی رہتی ہے۔ سبحان اللہ، طبع بوقلموں کی نیرنگ آرائیاں دیکھیے! ایک طرف دریا سے ہم عنانی کا یہ ذوق و شوق،

دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی! شاید یہ اس لیے ہو کہ اقلیمِ زندگی کی سطح پر پانی بہتا ہے، تہہ میں آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ اسی لیے نکتہ سرایانِ حقیقت کو کہنا پڑا کہ:

ہم سمندر باش و ہم ماہی، کہ در اقلیمِ عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست!

لوگ گرمیوں میں پہاڑ جاتے ہیں کہ وہاں کی گرمیوں کا موسم بسر کریں۔ میں نے کئی بار جاڑوں میں پہاڑوں کی راہ لی کہ وہاں جانے کا اصلی موسم یہی ہے۔ متنبی بھی کیا بد ذوق تھا کہ لبنان کے موسم کی قدر نہ کر سکا۔ میری زندگی کے چند بہترین ہفتے لبنان میں بسر ہوئے ہیں۔

وجبال لبنان، وکیف بقطعها　　　وھی الشتاء، وصیفھن شتاء!

زندگی کا ایک جاڑا جو موصل میں بسر ہوا تھا مجھے نہیں بھولتا۔ موصل اگرچہ جغرافیہ کی لکیروں میں معتدل خطے سے باہر نہیں ہے لیکن گرد و پیش نے اسے سردسیر حدود میں داخل کر دیا ہے، اور کبھی کبھی تو دیار بکر میں ایسی سخت برف پڑتی ہے کہ جب تک سڑکوں پر کھدائی نہ ہو لے، گھروں کے کواڑ کھل نہیں سکتے۔ جس سال میں گیا تھا، غیر معمولی برف پڑی تھی۔ برف باری کے بعد جب آسمان کھلتا اور آرمینیا کے پہاڑوں کی ہوائیں چلتیں، تو کیا عرض کروں، ٹھنڈک کا کیا عالم ہوتا؟ مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی سردی کی شدت کا یہ عالم ہوتا کہ مشکوں کا ڈھکنا ہٹاتے

تو پانی کی جگہ برف کی سِل دکھائی دیتی۔ لیکن ہیں پھر بھی سردی کی بے اعتدالیوں سے گلہ مند نہ تھا۔ جس شیخ کے گھر مہمان تھا، اُس کے بچے دن بھر برف کے گولوں سے کھیلتے رہتے، اور کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی گولی مُنہ میں بھی ڈال لیتے۔ ہستی کبیرہ یعنے شیخ کی ماں کا لونڈیوں کو حکم تھا کہ میرا آتشدان چوبیس گھنٹے روشن رکھیں۔ خود بھی دن میں دو تین مرتبہ پکار کے مجھ سے پوچھ لیا کرتیں کہ مجرہ کا کیا حال ہے؟ ایک لوہے کی کیتلی آتشدان کی محراب میں زنجیر سے لٹکی رہتی، اور پانی ہر وقت جوش کھاتا رہتا۔ جس وقت چاہو، قہوہ بنا کر گرم گرم پی لو۔ چونکہ دیر تک جوش کھائے ہوئے پانی میں چائے یا کافی بنانا ٹھیک نہیں، اس لیے میں اُسے اُتار کر رکھ دیا کرتا، لیکن لونڈی پھر لٹکا دیتی اور کہتی کہ ستی کا حکم ایسا ہی ہے۔ چائے بنانے کا یہی طریقہ میں نے شمالی ایران کے عام گھروں میں بھی دیکھا۔ آتشدان کی آگ صرف کمرہ گرم کرنے ہی کے کام میں نہیں لائی جاتی بلکہ باورچی خانہ کا بھی آدھا کام دے دیتی ہے۔ لوگ آتشدان کی آگ پر چائے کا پانی بھی گرم کر لیتے ہیں اور کھانا بھی پکا لیتے ہیں۔ اگر شمالی ایران کے لوگ ایسا نہ کریں تو اتنا ایندھن کہاں سے لائیں کہ کمروں کو بھی گرم رکھیں اور باورچیخانہ کا چولھا بھی سُلگتا رہے؟ وہاں کے مکانوں میں آتشدان اتنے کشادہ ہوتے ہیں کہ کئی کئی دیگچیاں اُن میں بہ یک وقت لٹک سکتی ہیں۔ آتشدان کی محراب میں تعمیر کے وقت حلقے ڈال دیے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کے، جیسے ہمارے مکانوں کی چھتوں میں پڑے ہوتے ہیں

انہی حلقوں میں زنجیر ڈال دی اور کیتلی یا دیگچی لٹکا دی۔ بعض شہروں کی سراؤں کے ہر کمرہ میں آتشدان بنا ہے۔ جاڑوں میں سرائجی اسی آتشدان پر پلاؤ دم دے کر آپ کو کھلا دیگا اور کہیگا "جائے گرم مگذارید و بخورید!"

اگست کے مہینے میں جب ہم یہاں لائے گئے، تو بارش کا موسم عروج پر تھا اور ہوا خوشگوار تھی۔ بالکل ایسی فضا رہتی تھی، جیسی آپ نے جولائی اور اگست میں پونا کی دیکھی ہوگی۔ پانی یہاں عام طور پر بیس پچیس انچ سے زیادہ نہیں برستا لیکن پانی کی دو چار بوندیں بھی کافی خوشگواری پیدا کر دیتی ہیں۔ نمس بہت کم ہوتی ہے۔ ہوا برابر چلتی رہتی ہے۔

ستمبر اور اکتوبر اسی عالم میں گزرا لیکن جب نومبر شروع ہوا، تو طبیعت اس خیال سے افسردہ رہنے لگی کہ یہاں سردی کا موسم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ چھاؤنی کا کمانڈنگ افیسر جو پچھلا جاڑہ یہاں بسر کر چکا ہے، کہتا تھا کہ پونا سے کچھ زیادہ سردی تھی لیکن وہ بھی بمشکل دس بارہ دن تک رہی ہوگی۔ عام طور پر ڈسمبر اور جنوری کا موسم یہاں ایسا رہتا ہے جیسا دہلی اور پنجاب میں جاڑے کے ابتدائی دنوں کا ہوتا ہے۔ ان خبروں نے طبیعت کو بالکل مایوس کر دیا تھا لیکن جونہی ڈسمبر شروع ہوا، موسم نے اچانک کروٹ بدلی۔ دو دن تک بادل چھایا رہا۔ اور پھر جو مطلع کھلا، تو کچھ نہ پوچھیے، موسم کی فیاضیوں کا کیا عالم ہوا؟ دہلی اور لاہور کے چلّہ کا مزہ یاد آگیا۔ یہاں کے کمروں میں بھلا آتشدان کہاں؟

لیکن اگر ہوتا، تو موسم ایسا ضرور ہو گیا تھا کہ میں لکڑیاں چبنی شروع کر دیتا۔ چیتہ خاں جو ہر وقت خاکی تخفیفہ (یعنے شارٹ) پہنے رہتا تھا، یکایک گرم سوٹ پہن کر آنے لگا اور کہنے لگا کہ سردی سے میرے گھٹنوں میں درد ہونے لگا ہے۔ چھاؤنی سے خبر آئی کہ ایک انگریز سپاہی جو رات کے پہرہ پر تھا، صبح نمونیا میں مبتلا پایا گیا اور شام ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ ہمارے قافلہ کے زندانیوں کا یہ حال ہوا کہ دوپہر کے وقت بھی چادر جسم سے چمٹی رہنے لگی۔ جسے دیکھو، سردی کی بیجا ستانیوں کا شاکی ہے، اور دھوپ میں بیٹھ کر تیل کی مالش کرا رہا ہے کہ تمام جسم پھٹ کر چھلنی ہو گیا۔ حتیٰ کہ جو صاحب دہلی اور یو۔پی کے رہنے والے ہیں، اور نینی تال کے موسم کے عادی رہ چکے ہیں، وہ بھی یہاں کے جاڑے کے قائل ہو گئے:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

ضلع کا کلکٹر اسی علاقہ کا باشندہ ہے۔ وہ آیا تو کہنے لگا کہ سالہا سال گزر گئے، میں نے ایسا جاڑا اس علاقہ میں نہیں دیکھا۔ پارا چالیس درجہ سے بھی نیچے اُتر چکا ہے۔ یہاں سب حیران ہیں، کہ اس سال کونسی نئی بات ہو گئی ہے کہ اچانک پنجاب کی سردی احمد نگر پہنچ گئی۔ میں نے جی میں کہا۔ ان بے خبروں کو کیا معلوم کہ ہم زندانیوں اور خراباتیوں کی دعائیں کیا اثر رکھتی ہیں!

رُبَّ اشعثَ مدفوعٍ بالابواب، لو اقسم علی اللہ لابرّہ!

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباسِ بہار

بعذرخواہیِ رندانِ بادہ نوش آمد!

یہاں کے لوگ تو سردی کی سختیوں کی شکایت کر رہے ہیں، اور میرے دلِ آرزو مند سے اب بھی صدائے ھَل مِن مزید اُٹھ رہی ہے۔ کلکتہ سے گرم کپڑے آئے پڑے ہیں۔ میں نے ابھی تک اُنہیں چھوا بھی نہیں۔ اِس ڈر سے کہ اگر گرم کپڑے پہنوں گا تو سردی کا احساس کم ہو جائیگا اور تخیل کو جولانیوں کا موقعہ نہیں ملیگا، ابھی تک گرمیوں ہی کے لباس میں وقت نکال رہا ہوں۔ البتہ صبح اُٹھتا ہوں تو اونی چادر دُہری کر کے کاندھوں پر ڈال لیتا ہوں۔ میرا اور سردی کے موسم کا معاملہ تو وہ ہو گیا، جو نظیری نیشاپوری کو پیش آیا تھا:

او در وداع و من بجزع، کز مئے و بہار

رطلے سہ چار ماندہ و روزے سہ چار خوش!

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ خیال ہوا، تمہید ہی میں گیارہ صفحے سیاہ ہو گئے، اور ابھی تک حرفِ مدعا زبانِ قلم پر نہیں آیا۔ تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک ماہ کی محرومی وانتظار کے بعد پرسوں چیتہ خاں نے مژدۂ کامرانی سنایا کہ بمبئے کے آرمی اینڈ نیوی اسٹور نے وہائٹ جیسمین چائے کہیں سے ڈھونڈھ نکالی ہے، اور ایک پونڈ کا پارسل وی پی کر دیا ہے۔ چنانچہ کل پارسل پہنچا۔ چیتہ خاں نے اس کی قیمت کا لگہ

کرنا شروع کر دیا کہ تمہیں ایک پونڈ چائے کے لیے اتنی قیمت دینی پڑی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس کی ارزانی نے حیران کر دیا ہے۔ اس نایابی کے زمانے میں اگر اسٹور اس سے دوگنی رقم کا بھی طلبگار ہوتا، جب بھی یہ جنس گرانمایہ ارزاں تھی:

اے کہ می گوئی "چرا جامے بہ جانے می خری؟"
ایں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است!

حسن اتفاق دیکھیے کہ اِدھر یہ پارسل پہنچا اُدھر بمبئے سے بعض دوستوں نے بھی چند ڈبے چینی دوستوں سے لے کر بھجوا دیے۔ اب گرفتاری کا زمانہ جتنا بھی طول کھینچے، چائے کی کمی کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

بہرحال جو بات کہنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس ایک واقعہ نے صبح کے معاملہ کی پوری فضا بدل دی، اور جوئے طبعِ افسردہ کا آبِ رفتہ پھر واپس آگیا۔ اب پھر وہی صبح کی مجلسِ طرب آراستہ ہے۔ وہی طبعِ سیہ مست کی عالم فراموشیاں ہیں، اور وہی فکرِ درماندۂ کار کی آسماں پیمائیاں:

گوہرِ مخزنِ اسرار ہمانست کہ بود — حقّۂ مہر بداں مہر و نشانست کہ بود
حافظا باز نما قصۂ خونابۂ چشم — کہ دریں چشمہ ہماں آب روانست کہ بود

ابوالکلام

قلعۂ احمد نگر
۹- جنوری سنہ ۴۳ء

صدیقِ مکرم انانیتی ادبیات Egotistic Literuture
کی نسبت زمانۂ حال کے بعض نقادوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ یا تو بہت زیادہ دلپذیر ہونگی یا بہت زیادہ ناگوار۔ کسی درمیانی درجہ کی یہاں گنجائش نہیں۔ "انانیتی ادبیات" سے مقصود تمام اس طرح کی خامہ فرسائیاں ہیں جن میں ایک مصنف کا ایگو (Ego) یعنے "میں" نمایاں طور پر سر اٹھاتا ہے۔ مثلاً خود نوشتہ سوانح عمریاں، ذاتی واردات و تاثرات، مشاہدات و تجارب، شخصی اسلوب نظر و فکر۔ میں نے "نمایاں طور" کی قید اس لیے لگائی کہ اگر نہ لگائی جائے تو دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو جائیگا۔ کیونکہ غیر نمایاں طور پر تو ہر طرح کی مصنفات میں مصنف کی انانیت اُبھر سکتی ہے اور اُبھرتی رہتی ہے۔ اگر اس اعتبار سے صورتِ حال پر نظر ڈالیے، تو ہماری درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ہم نے اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچا لے جا سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے نہیں بچا سکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں، لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہیگی۔ ہم جہاں جاتے ہیں، ہمارا سایہ ہمارے ساتھ

جاتا ہے۔ ہماری کتنی ہی خود فراموشیاں ہیں جو دراصل ہماری خود پرستیوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نکتہ شناسِ حقیقت کو کہنا پڑا تھا:

فقلتُ لها "ما اذنبتُ؟" قالت مجیبة

"وجودك ذنبٌ لا یقاس به ذنب!"

کل ایک زیرِ تسوید کتاب کا ایک خاص مقام لکھ رہا تھا کہ مبحث کی مناسبت سے قول مندرجۂ صدر ذہن میں تازہ ہو گیا اور اس وقت حسبِ معمول صبح کو لکھنے بیٹھا تو بے اختیار سامنے اُبھر آیا۔ آئیے، آج تھوڑی دیر کے لیے رُک کر اس معاملہ پر غور کریں۔

ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مصوّر، ایک اہلِ قلم کی "انانیت" (Egotism) کیا ہے؟ ابھی نہ تو فلسفۂ اخلاق کے مذہبِ انا (Egoism)، کا رُخ کیجیے۔ نہ "خودی" (I-amness) مصطلحۂ تصوف میں جائیے۔ صرف ایک عام تحلیلی زاویۂ نگاہ سے معاملہ کو دیکھیے۔ آپ کو صاف دکھائی دیگا کہ یہ انانیت دراصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اُس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا۔ اگر دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ اُبھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔ ابو العلاء معرّی نے جب اپنا مشہور لامیہ کہا تھا:

الا فی سبیل المجد ما انا فاعل

عفاف واقدام وحزم ونائل!

یا جب ابو فراس حمدانی نے اپنا لافانی رائیہ کہا:

اراك عصی الدمع شیمتك الصبر
اما للهوى نهی علیك ولا امر

یا جب ابن سنار الملک نے اپنے زمانہ کو مخاطب کیا تھا:

وانك عبدی یا زمان' واننی — علی الرغم منی ان اری لك سیدا
وما انا راض اننی واطی الثری — ولی همة لا ترتضی الافق مقعدا

یا جب فردوسی کے قلم سے نکلا تھا:

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی!

یا مثلاً جب فیضی نے نل دمن نظم کرتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:

امروز نہ شاعرم، حکیم — دانندۂ حادث وقدیم
ہر موئے زمن تمام گوش ست — خاموشی من بصد خروش ست
ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم — خونے ست چکیدہ از دماغم
صد دیدہ بہ ورطۂ دل اُفتاد — کیں موجِ گہر بساحل اُفتاد
بگداختہ آبگینۂ دل — آئینہ دہم بدستِ محفل
آنم کہ بسحر کاری ژرف — از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگِ قلمم دریں شب تار — بس معنیٔ خفتہ کردہ بیدار

می ریخت ز سحر کاری ژرف　　از صبح ستارۂ و زمن حرف
ہر نغمہ کہ بستہ ام بریں تار　　ناقوس نہفتہ ام بہ زنّار
ایں گل کہ بہ بوستاں نثاری ست　　از من بہ بہار یادگاری ست!

تو یہ محض شاعرانہ تعلیاں نہ تھیں۔ یہ ان کی پرجوش انفرادیت تھی جو بے اختیار چیخ رہی تھی!

لیکن ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں، انانیت کا یہ شعور کچھ اس نوعیت کا واقع ہوا ہے کہ ہر انفرادی انانیت اپنے اندرونی آئینہ میں جو عکس ڈالتی ہے، بیرونی آئینوں میں اُس سے بالکل اُلٹا عکس پڑنے لگتا ہے۔ اندر کے آئینہ میں ایک بڑا وجود دکھائی دیتا ہے۔ باہر کے تمام آئینوں میں ایک چھوٹی سے چھوٹی شکل اُبھرنے لگتی ہے:

خودی آئینہ دارد کہ محروم ست اظہارش!

یہی صورتِ حال ہے جہاں سے ہر مصنف کی جو خود اپنی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہے، ساری مشکلیں اُبھرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ جبکہ خود اپنے عکس کو جو اُس کے اندرونی آئینہ میں پڑ رہا ہے، جھٹلا نہیں سکتا، تو اچانک کیا دیکھتا ہے کہ باہر کے تمام آئینے اُسے جھٹلا رہے ہیں جو "میں" خود اُس کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے، وہی دوسروں کی نگاہوں میں یکسر غیر اہم ہو رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی حالت میں محسوس کرنے لگتا ہے، جیسے ایک مصوّرِ

تصویر کھینچنے کے لیے موقلم اُٹھائے، مگر اُسے یقین ہو کہ میں کتنی ہی مصورانہ قوت کام میں لاؤں: میری نگاہ کے سوا اور کوئی نگاہ اس مرقع کی دلاویزی نہیں دیکھ سکیگی:

آئینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست
تصویرِ خود بلوحِ دگر می کشیم ما!

اس مشکل سے صرف خال خال مصنف ہی عہدہ برا ہو سکتے تھے اور ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی "انانیت" کو بغیر کسی نمائشی وضع میں سجائے، دوسروں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دنیا کے سامنے ان کی "انانیت" آئی، مگر اس طرح آئی، جیسے ایک بے تکلف آدمی بغیر سج دھج بنائے سامنے آکھڑا ہو۔ یہ بات کہ ایک آدمی بغیر کسی بناوٹ کے اپنی واقعی صورت میں سامنے آگیا، نمودِ حقیقت کی ایک خاص دلکشی رکھتی ہے اور اس لیے دنیا کی نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ جو خاص خاص ادیب ایسا کر سکے، ان کی "میں" خود ان کے لیے کتنی ہی بڑی اور دوسروں کے لیے کتنی ہی چھوٹی واقع ہوئی ہو، لیکن دنیا اُس کی دلپذیری سے انکار نہ کر سکی۔ دنیا کو ان کی انانیت کی مقدار ناپنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ وہ اس کی بے تکلفانہ واقعیت دیکھ کر بے خود ہو گئی!

ایک آدمی جب اپنی تصویر اُتروانی چاہتا ہے، تو خود اُسے اس کا شعور

ہو یا نہ ہو، لیکن اس خواہش کی تہہ میں اس کی انانیت کی ایک دھیمی آواز ضرور بولنے لگتی ہے۔ تصویر اتروانے کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک حالت وہ ہے جسے مصورانہ وضع (Pose) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی تصویر اتروانے کے لیے ایک خاص طرح کا انداز بہ تکلف اختیار کر لینا۔ ایک ماہر فن مصور جانتا ہے کہ کس چہرے اور جسم کی مصورانہ وضع کیسی ہونی چاہیے؟ وہ جب تک نشست و وضع کی نوک پلک درست نہیں کریگا، تصویر نہیں اُتاریگا۔ سو میں ننانوے آدمیوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ نشست اور ڈھنگ سجا کے تصویر اُتروائیں۔ لیکن فرض کرو۔ ایک آدمی بغیر کسی طیاری اور وضعی انداز کے آلۂ انعکاس کے سامنے آگیا اور اسی عالم میں اس کی تصویر اُتر آئی، تو ایسی تصویر کس نگاہ سے دیکھی جائیگی؟ ایسی تصویر محض اس لیے کہ بے ساختگی اور واقعیت کی ٹھیک ٹھیک تعبیر پیش کرتی ہے، یقیناً ایک خاص قدر و قیمت پیدا کر لیگی، اور جس صاحب نظر کے سامنے جائیگی، اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیگی۔ وہ یہ نہیں دیکھیگا کہ جس کی تصویر ہے، وہ خود کیسا ہے؟ وہ اس میں محو ہو جائیگا کہ خود تصویر کتنی بے ساختہ ہے!

بعینہ یہی مثال اس صورتِ حال کی بھی سمجھ لیجیے۔ جو مصنف اپنی انانیت کی بے ساختہ تصویر کھینچ دے سکتے ہیں، وہ اس معاملہ کی سازی مشکلوں پر۔

غالب آجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصویر خود اپنے قلم سے کھینچی لیکن یہ بات اس کی دلآویزی میں کچھ مخل نہ ہوسکی۔ کیونکہ تصویر بے تکلف اور بے ساختہ کھینچی۔ وہ لوگوں کو باعظمت دکھائی دے یا نہ دے لیکن اُس کی بے ساختگی کی گیرائی سب کی نگاہوں کو لبھالیگی۔ ایسے ہی صنعت ہیں جو انپی انانیت کو لافانی دلپذیری کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کی تمام معنوی محسوسات کی طرح اُس کی انفرادیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف طرح کی نوعیتیں رکھتی ہے۔ کبھی وہ سوتی رہتی ہے، کبھی جاگ اُٹھتی ہے، کبھی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، اور پھر کبھی زور و شور سے اُچھلنے لگتی ہے۔ انسان کی ساری قوتوں کی طرح وہ بھی نشوٗ و نما کی محتاج ہوئی۔ جس طرح ہر انسان کا ذہن و ادراک یکساں درجہ کا نہیں ہوتا، اُسی طرح انفرادیت کا جوش بھی ہر دیگ میں ایک ہی طرح نہیں اُبلتا۔ مدارج کا یہی فرق ہے جو ہم تمام ادیبوں، شاعروں، مصوروں، اور موسیقی نوازوں میں پاتے ہیں۔ اکثروں کی انفرادیت بولتی ہے مگر دھیمے سروں میں بولتی ہے۔ بعضوں کی انفرادیت اتنی پرجوش ہوتی ہے کہ جب کبھی بولیگی، سارا گرد و پیش گونج اُٹھیگا:

یک بار نالہ کردہ ام از دردِ اشتیاق
از کشش جہت ہنوز صدامی تواں شنید!

اسی لیے ایک عرب شاعر کو کہنا پڑا تھا:

وما الدھرُ الا من رواۃ قصائدی

اذا قلتُ شعراً ، اصبح الدھر منشداً!

ایسے افراد اپنی "میں" کا سرجوش کسی طرح نہیں دبا سکتے۔ اُن کی خاموشی بھی چیخنے والی اور اُن کا سکون بھی تڑپنے والا ہوتا ہے۔ اُن کی انفرادیت دبانے سے اور زیادہ اچھلنے لگتی ہے۔ ایسے افراد جب کبھی "میں" بولتے ہیں، تو اس میں قصد، بناوٹ، اور نمائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سرتاسر حقیقتِ حال کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہوتی ہے۔ فیضی کی ایک ایسی ہی چیخ تھی جو اس وقت تک ہمارے سامعہ سے ٹکرا رہی ہے:

می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما

جوشِ آتش بود امروز بہ فوارۂ ما!

لیکن ہر قانون کی طرح یہاں بھی مستثنیات ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی ایسی شخصیتیں بھی دنیا کے مرسح (اسٹیج) پر نمودار ہو جاتی ہیں جن کی انانیت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی، بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے۔ یعنے خود اُنہیں اُن کی انانیت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے، اُتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ اُن کی انانیت کی پرچھائیں جب کبھی پڑیگی، تو خواہ اندر کا آئینہ ہو خواہ باہر کا، اُس کے ابعادِ ثلاثہ (Dimensions) ہمیشہ یکساں طور پر نمودار ہونگے!

ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیارِ نظر سے الگ رکھنا پڑیگا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے۔ ادب و تصنیف کے عام قوانین اُنہیں اپنے شکنجوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانے کو اُن کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں۔ اُن کی ہر "میں" اُن کی ہر "وہ" اور "تم" سے کہیں زیادہ دلپذیر ہوتی ہے!

انانیتی ادبیات کی کوئی خاص قسم لے لیجیے۔ مثلاً خود نوشتہ سوانح و واردات، اور پھر مثال کے لیے بغیر کاوش کے چند شخصیتیں چن لیجیے۔ مثلاً سینٹ آگسٹائن (Augustine)، روسو، اسٹرنڈ برگ (Strind Berg) ٹالسٹائی، اناطول فرانس، آندری ژید (Andregide) ان کے خود نوشتہ سوانح چھ مختلف نوعیتوں کی چھ مختلف تصویریں ہیں، لیکن سب نے یکساں طور پر ادبیاتِ عالم میں دائمی جگہ حاصل کر لی۔ کیونکہ تصویریں بے ساختہ اور واقعی ہیں۔ مشرقی ادبیات میں مثلاً غزالی، ابن خلدون، بابر، جہانگیر، اور ملا عبدالقادر بدایونی کے خود نوشتہ حالات سامنے لائیے۔ ہم کتنی ہی مخالفانہ نگاہوں سے اُنہیں پڑھیں، لیکن ان کی دلآویزی کے مطالبہ سے انکار نہیں کر سکتے۔ غزالی نے اپنے فکری انفعالات کی سرگزشت سُنائی۔ ابن خلدون نے اپنے تعلیمی اور سیاسی علائق کی داستان سرائی کی۔ بابر نے جنگ اور امن کے واقعات و واردات قلمبند کیے۔ جہانگیر نے تختِ شہنشاہی پر بیٹھ کر وقائع نگاری کا قلمدان طلب کیا۔

ان سب میں ان کی انانیتیں بے پردہ بول رہی ہیں۔ ہم انہیں خود اُن کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ تاہم دیکھتے ہیں اور ان کی لافانی دلاویزی سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بغیر کسی بناوٹ کے سامنے آگئی ہیں۔

بدایونی کا معاملہ اوروں سے الگ ہے۔ طبقۂ عوام کا ایک فرد جس نے وقت کی درسیاتی تعلیم حاصل کر کے علماء کے حلقہ میں اپنی جگہ بنائی اور دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کرلی۔ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز اُبھرتی ہے، تو وہ اُس کی بے لچک تنگ نظری، بے روک تعصب، اور بے میل راسخ الاعتقادی ہے۔ ہمیں اُس کی انانیت نہ صرف بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہے، بلکہ قدم قدم پر انکار و تبرّی کی دعوت دیتی ہے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ اس پر بھی ہم اپنی نگاہوں کو اُس کی طرف اُٹھنے سے روک نہیں سکتے؟ ہم اُسے پسند نہیں کرتے۔ پھر بھی اُسے پڑھتے ہیں اور جی لگا کر پڑھتے ہیں۔ غور کیجیے۔ یہ وہی بات ہوئی جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی، ہم سوچ رہے تھے۔ جس شخص کی یہ تصویر ہے، وہ خود خوبصورت نہیں ہے لیکن تصویر بہ حیثیت ایک تصویر کے خوبصورت ہے۔ اس لیے ہماری نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف متوجّہ کر لیتی ہے۔ یہ صاحبِ تصویر نہیں تھا جس نے ہماری نگاہوں کو کھینچا۔ یہ تصویر کی بے ساختگی تھی جس کے بلاوے کی کشش سے ہم اپنے آپ کو نہ بچا سکے!

ثالثؔ ٹی غالباً اُن خاص شخصوں میں سے تھا جن کی انانیت کی مقدار

اضافی ہونے کی جگہ ایک مطلق نوعیت رکھتی ہے۔ اُس کی انانیت خود اُسے جتنی بڑی دکھائی دی، دنیا نے بھی اُسے اتنا ہی بڑا دیکھا پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دور میں شاید ہی وقت کا کوئی مصنف اس خود اعتمادی کے ساتھ "میں" بول سکا، جس طرح یہ عجیب وغریب روسی بولتا رہا۔ اُس کے خود نوشتہ حالات، اُس کے شخصی واردات و تاثرات، اس کے مختلف وقتوں کے مکالمے اور روزنامچے، اُس کے ادبی اور فنی مباحث، سب میں اُس کی انانیت بغیر کسی نقاب کے دنیا کے سامنے آئی، اور دنیا اُسے عالمگیر نوشتوں کے ساتھ جمع کرتی رہی۔ اس کے خود نوشتہ سوانح جو ایک بے رنگ سادگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اُس کی وار اینڈ پیس اور اینا کارنینا سے کم دلپذیر نہیں ہیں، اور دراصل ان دونوں افسانوں میں بھی اُس کی انانیت ہی کی صدائیں ہم سُن رہے ہیں۔ زمانہ اس کی قلم کاریوں کا رنگ و روغن ابھی تک مدھم نہیں کر سکا۔ پچھلی جنگ کے زمانہ میں لوگ وار اینڈ پیس از سرِ نو ڈھونڈھنے لگے تھے اور اب پھر ڈھونڈ رہے ہیں!

موجودہ عہد میں ٹالسٹائی کی عظمت بہ حیثیت ایک مفکر کے بہت کم دماغوں کو متوجہ کر سکیگی۔ یورپ اور امریکہ کے دماغی طبقوں میں بہت کم لوگ ایسے نکلینگے جو اُس کے معاشرتی، فلسفی، اور جمالیاتی (Aesthetics) افکار کو اُس نظر سے دیکھنے کے لیے طیار ہوں، جس نظر سے اس صدی کے ابتدائی

دور کے لوگ دیکھا کرتے تھے۔ تاہم اُس کی انانیتی ادبیات کی دلپذیری سے اب بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اُس کی عجیب زندگی کا معمہ اب بھی بحث و نظر کا ایک دل پسند موضوع ہے۔ ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی نئی کتاب نکلتی رہتی ہے۔

پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دور میں بکثرت خود نوشتہ سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے ہر چھپے مصنف نے ضروری سمجھا کہ اپنی گزری ہوئی زندگی کو آخری عمر میں پھر ایک مرتبہ دہرا لے۔ دنیا کے کتب خانوں نے ان سب کو اپنی الماریوں میں جگہ دی ہے، لیکن دنیا کے دماغوں میں بہت کم کے لیے جگہ نکل سکی۔

میں نے ابتدائی سطور میں "ایجو" کا لفظ استعمال کیا ہے یہ وہی یونانی Ego کی تعریب ہے جو ارسطو کے عربی مترجموں نے ابتدا ہی میں اختیار کر لی تھی اور پھر فارابی اور ابن رشد وغیرہم برابر استعمال کرتے رہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فلسفیانہ مباحث میں "انا" کی جگہ "ایجو" کا استعمال زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ براہِ راست فلسفیانہ اصطلاح کو رونما کر دیتا ہے اور ٹھیک وہی کام دیتا ہے جو یورپ کی زبانوں میں "ایگو" دے رہا ہے۔ یہ اُس اشتباہ کو بھی دور کر دیگا جو "انا" مصطلحۂ فلسفہ اور "انا" مصطلحۂ تصوف میں باہم گر پیدا ہو جا سکتا ہے۔ اُردو میں ہم "ایگو" بجنسہٖ لے سکتے ہیں کیونکہ ہمیں گاف سے احتراز کرنے کی ضرورت نہیں۔

ابوالکلام

حکایتِ زاغ و بلبل

قلعہ احمد نگر

مارچ سنہ ۴۳ء

صدیقِ مکرم کل عالمِ تصور میں حکایتِ زاغ و بلبل ترتیب دے رہا تھا:

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا!

اس وقت خیال ہوا، ایک فصل آپ کو بھی سُنا دوں:

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم!

ایک دن صبح چائے پیتے ہوئے نہیں معلوم سید محمود صاحب کو کیا سوجھی، ایک طشتری میں تھوڑی سی شکر لے کر نکلے، اور صحن میں جا بجا کچھ ڈھونڈھنے سے لگے۔

گوئی ایں طائفہ این جا گہرے یافتہ اند

جب اُن کا تعاقب کیا گیا تو معلوم ہوا، چیونٹیوں کے بل ڈھونڈھ رہے ہیں۔ جہاں کوئی سوراخ دکھائی دیا، شکر کی ایک چٹکی ڈال دی۔ میں نے جو یہ حال

دیکھا تو یہ کہہ کر اُن کے سمندِ سعی پر ایک اور تازیانہ لگا دیا کہ:

وللارض من کاس الکرام نصیب:

کہنے لگے اس کا ترجمہ کیجیے۔ میں نے کہا: خواجہ شیراز مع اضافہ کے کر چکے ہیں:

اگر شراب خوری جرعہ فشاں برخاک

ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک!

یہاں کمروں کی چھتوں میں گوریاؤں کے جوڑوں نے جا بجا گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ دن بھر ان کا شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہوا، ان کی بھی کچھ تواضع کرنی چاہیے۔ ممکن ہے، گوریاؤں کی زبانِ حال نے اُنہیں توجہ دلائی ہو کہ:

نگاہِ لطف کے اُمیدوار ہم بھی ہیں!

چھپرہ میں ایک مرتبہ اُنہوں نے مرغیاں پالی تھیں۔ دانہ ہاتھ میں لے کر آ۔ آ۔ کرتے تو ہر طرف سے دوڑتی ہوئی چلی آتیں۔ یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا۔ لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے۔ کہنے لگے، عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں، اُتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں۔ گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا:

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا، طلب و نیازکی راہ میں قدم اُٹھایا ہے، تو عشوہ و ناز کی تغافل کیشیوں کے لیے صبر و شکیب پیدا کیجیے۔ نیازِ عشق کے دعووں کے ساتھ نازِ حُسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں:

بہ نازکی نہ بری پے بہ منزلِ مقصود گر طریقِ رہش از سرِ نیاز کنی

اگر بہ ناز براند مرو، کہ آخرِ کار بہ صد نیاز بخواند ترا، و ناز کنی!

یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی میناؤں کے بھی دو تین جوڑے آنکلتے ہیں اور اپنی غٹرغوں اور چوں چوں کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ اب محمود صاحب نے گوریاؤں کے عشق پر تو واسوخت پڑھا، مگر ان آہوانِ ہوائی کے لیے دامِ ضیافت بچھا دیا:

من و آہوئے صحرائے کہ دائم می رمید از من!

روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کھڑے ہوتے۔ پھر جہاں تک حلق کام دیتا، آ، آ، آ کرتے جاتے، اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلائے عام میناؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی۔ البتہ شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا۔ میں نے کوؤں کو شہرستانِ ہوا کا دریوزہ گر اس لیے کہا کہ کبھی انہیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ طفیلیوں کے غول میں بھی بہت کم دکھائی پڑے۔ ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہنچے،

صدائیں لگائیں اور چل دیے:

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے!

بہرحال محمود صاحب آ، آ کے تسلسل سے تھک کر جونہی مُڑتے، یہ دریوزہ گرانِ کوتہ آستین فوراً بڑھتے، اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے:۔

اے کوتہ آستیناں! تا کے درازدستی!

صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے۔ اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں۔ اُنہوں نے جو دیکھا کہ:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

تو فوراً لبیک اور "مرحمتِ عالی زیاد" کہتے ہوئے اس دسترخوانِ کرم پر ٹوٹ پڑیں:

یاراں! صلائے عام ست گرمی کنید کارے!

کوؤں کی دراز دستیوں سے جو کچھ بچتا، ان کوتاہ دستوں کی کامجوئیوں کا کھاجا بن جاتا۔ پہلے روٹی کے ٹکڑوں پر منہ مارتیں، پھر فوراً گردن اُٹھا لیتیں۔ ٹکرا چباتی جاتیں، اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے بھی کرتی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو دادِ ضیافت دیتے ہوئے بہ طریقِ حسنِ طلب یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ:

گرچہ خوب است، و لیکن قدرے بہتر ازیں!

خیر، بیچاری گلہریوں کا شمار تو اس سفرہ کرم کے ریزہ چینوں میں ہوا، لیکن کوّے جنہیں طفیلی سمجھ کر میزبانِ عالی ہمت نے چنداں تعرض نہیں کیا تھا، اچانک اس قدر بڑھ گئے، کہ معلوم ہونے لگا، پورے احمد نگر کو اس بخشش عام کی خبر مل گئی ہے، اور علاقہ کے سارے کوّوں نے اپنے اپنے گھروں کو خیرباد کہہ کر یہیں دھونی رمانے کی ٹھان لی ہے۔ بیچاری میناؤں کو جو اس اہتمام ضیافت کی اصلی مہمان تھیں۔ ابھی تک خبر بھی نہیں پہنچی تھی، اور اب اگر پہنچ بھی جاتی تو بھلا طفیلیوں کے اس ہجوم میں ان کے لیے جگہ کہاں نکلنے والی تھی:

طفیلی جمع شد چنداں کہ جائے میہماں گم شد!

محمود صاحب کے صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کوّوں کی کائیں کائیں کی روشن چوکی برابر بجتی رہتی تھی۔ اب جو ان کا دسترخوانِ کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑ گئی۔ ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا۔ آخر ان سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رُک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لیے ملتوی ہی کر دیجیے۔ ورنہ اِن ترکانِ یغما دوست کی ترکتازیاں کمروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دینگی۔ اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوّوں کو خبر ملی ہے۔ اگر فیض عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو تعجب نہیں تمام دکن کے کوّے قلعۂ احمد نگر پر حملہ بول دیں، اور آپ کو صائب کا شعر یاد دلائیں کہ:

دور دستاں را باحساں یاد کردن ہمت ست   ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند

ابھی محمود صاحب اس درخواست پر غور کر ہی رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آگیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمّر و مسِن گِدھ بھی تشریف لے آئے ہیں:

پیری سے کمر میں اِک ذرا خم توقیر کی صورت مجسّم!

اور گردن اٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں:

اے خانہ بر اندازِ چمن! کچھ تو اِدھر بھی!

معلوم ہوتا ہے، ان ناخواندہ مہمانوں کی آمد محمود صاحب پر بھی باایں ہمہ جود و سخائے عام، گراں گزری۔ کہنے لگے، بزرگوں نے کہا ہے، گِدھوں کا آنا منحوس ہوتا ہے۔ بہ ہر حال ان حضرات کے بارے میں بزرگانِ سلف کا کچھ ہی خیال رہا ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری ہمارے لیے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی۔ کیونکہ اِدھر ان کا مبارک قدم آیا، اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لیے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ ان کی آمد ہی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھیے، کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آگیا:

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب
قصد کعبہ کا نہ کیجیے گا بہ این یُمنِ قدوم!

خیر چند دنوں کے بعد بات آئی گزری ہوئی۔ لیکن کوّوں کے غولوں سے

اب نجات کہاں ملنے والی تھی؟ دریوزہ گروں نے کریم کی چوکھٹ پہچان لی۔ وہ روز معین وقت پر آتے اور اپنے فراموش کار میزبان کو پکار پکار کے دعائیں دیتے:

میاں، خوش رہو، ہم دعا کر چلے!

اسی اثنا میں موسم نے پلٹا کھایا۔ جاڑے نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ بہار کی آمد آمد کا غلغلہ برپا ہوا۔ اگرچہ ابھی تک:

اُڑتی سی اک خبر تھی زبانی طیور کی!

ہم جب گزشتہ سال اگست میں یہاں آئے تھے تو صحن بالکل چٹیل میدان تھا۔ بارش نے سبزہ پیدا کرنے کی بار بار کوششیں کیں لیکن مٹی نے بہت کم ساتھ دیا۔ اس بے رنگ منظر سے آنکھیں اُکتا گئی تھیں اور سبزہ و گل کے لیے ترسنے لگی تھیں۔ خیال ہوا کہ باغبانی کا مشغلہ کیوں نہ اختیار کیا جائے کہ مشغلہ کا مشغلہ ہوتا ہے، اور اصحابِ صورت اور اصحابِ معنی، دونوں کے لیے سامانِ ذوق بہم پہنچاتا ہے۔

بہ بو اصحابِ معنی را بہ رنگ اصحابِ صورت را!

جواہر لال جن کا جوہرِ مستعدی ہمیشہ ایسی تجویزوں کی راہ تکتا رہتا ہے، فوراً کمربستہ ہو گئے، اور اس خرابے میں رنگ و بو کی تعمیر کا سر و سامان شروع ہو گیا:

دل کے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی!

اس کارخانۂ رنگ و بو کے ہر گوشے میں وجود کی پیدائش اور جامۂ ہستی کی

آرائش کے لیے دو باتوں کی درستگی ضروری ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ بیج درست ہو!

گرجاں بدہد سنگِ سیہ لعل نہ گردد
باطینتِ اصلی چہ کند، بدگہر افتاد

دوسری یہ کہ زمین مستعد ہو:

جوہرِ طینتِ آدم زخمیرِ دگرست
تو توقع زگِلِ کوزہ گراں می داری

چنانچہ یہاں بھی سب سے پہلے انہی دو باتوں کی فکر کی گئی۔ بیج کے لیے چیتہ خاں کو کہہ کر پونا لکھوایا گیا کہ وہاں کے بعض باغوں کے ذخیرے بیجوں کی خوبی وصلاحیت کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن زمین کی درستگی کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ احاطہ کی پوری زمین دراصل قلعہ کی پورانی عمارتوں کا ملبہ ہے۔ ذرا کھودیے، اور پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے اور چونے اور ریت کا بُرادہ ہر جگہ سے نکلنے لگتا ہے۔ درمیانی حصّہ تو گویا گنبدوں اور مقبروں کا مدفن ہے۔ نہیں معلوم کن کن فرمانرواؤں اور کیسے کیسے پری چہروں کی ہڈیوں سے اس خرابے کی مٹی گوندھی گئی ہے، اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے:

قدح بہ شرطِ ادب گیر، زاں کہ ترکیبش
زکاسۂ سرِ جمشید و بہمن ست و قباد!

ناچار تختوں کی داغ بیل ڈال کر دو دو تین تین فٹ زمین کھود دی گئی، اور باہر

سے مٹی اور کھاد منگوا کر انہیں بھر اگیا، کئی ہفتے اس میں نکل گئے۔ جواہر لال صبح وشام پھاوڑا اور کدال ہاتھ میں لیے کوہ کندن اور کاہ برآوردن میں لگے رہتے تھے:

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل

قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم!

اس کے بعد آبپاشی کا مرحلہ پیش آیا، اور اس پر غور کیا گیا کہ کیمسٹری کے حقائق سے فنِ زراعت کے اعمال میں کہاں تک مدد لی جاسکتی ہے۔ اس موضوع پر اربابِ فن نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کیں۔ ہمارے قافلہ میں ایک صاحب بنگال کے ہیں جن کی سائنٹفک معلومات ہر موقعہ پر ضرورت ہو یا نہ ہو اپنی جلوہ طرازیوں کا فیاضانہ اسراف کرتی رہتی ہیں۔ انہوں نے یہ دقیق نکتہ سنایا کہ اگر پھولوں کے پودوں کو حیوانی خون سے سینچا جائے، تو ان میں نباتاتی درجہ سے بلند ہو کر حیوانی درجہ میں قدم رکھنے کا ولولہ پیدا ہو جائیگا، اور ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرنے لگینگے۔ لیکن آج کل جبکہ جنگ کی وجہ سے آدمیوں کو خون کی ضرورت پیش آگئی ہے اور اس کے بینک کھل رہے ہیں بھلا درختوں کے لیے کون اپنا خون دینے کے لیے طیار ہوگا! ایک دوسرے صاحب نے کہا، یہاں قلعہ کے فوجی مس میں روز مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں۔ ان کا خون جڑوں میں کیوں نہ ڈالا جائے؟ اس پر مجھے ارتجالاً ایک شعر سوجھ گیا، حالانکہ شعر کہنے کی عادت، مدتیں ہوئیں بھلا چکا ہوں:

کلیوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو مُرغی کے خون سے

اگر مرغی کی جگہ بلبل کر دیجیے تو خیال بندوں کی طرز کا اچھا خاصہ شعر ہو جائیگا:

غنچوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو بلبل کے خون سے

شعر سُن کر آصف علی صاحب کے شاعرانہ ولولے جاگ اُٹھے۔ اُنھوں نے اس زمین میں غزل کہنی شروع کر دی لیکن پھر شکایت کرنے لگے کہ قافیہ تنگ ہے میں نے کہا، ویسے بھی یہاں قافیہ تنگ ہی ہو رہا ہے!

دیکھیے، سمندِ فکر کی وحشت خرامی بار بار جادۂ سخن سے ہٹنا چاہتی ہے اور میں چونک کر باگ کھینچنے لگتا ہوں۔ جو بات کہنی چاہتا تھا، وہ یہ ہے کہ ستمبر اور اکتوبر میں بیج ڈالے گئے۔ ڈسمبر کے شروع ہوتے ہی سارے میدان کی صورت بدل گئی، اور جنوری آئی، تو اس عالم میں آئی کہ ہر گوشہ مالن کی جھولی تھا۔ ہر تختہ گل فروش کا ہاتھ تھا۔ گویا:

کنوں کہ دہ چمن آمد گل از عدم بہ وجود | بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بہ سجود
بہ باغ تازہ کن آئینِ دینِ زردشتی | کنوں کہ لالہ بر افروخت آتشِ نمرود
زدستِ شاہدِ سیمیں عذارِ عیسیٰ دم | شراب نوش و رہا کن حدیثِ عاد و ثمود!

کا عالم طاری ہو گیا۔ لیکن آئینِ زردشتی کے تازہ کرنے کا سامان یہاں کہاں تھا؟

اور شاہد بہیں عذار کے انفاسِ عیسوی کی اعجاز فرمائیاں کہاں میسر آسکتی تھیں:
سو اس کی کمی عالمِ تصور کی جولانیوں سے پوری کی گئی۔ زمانہ کی تنک مائگی
جس قدر کوتاہیاں کرتی رہتی ہے، فکرِ فراخ حوصلہ کی آسودگیاں اتنی ہی
بڑھتی جاتی ہیں:

چوں دستِ ما بہ دامنِ وصلش نمی رسد
پائے طلب شکستہ بداماں نشستہ ایم

وقت کی رعایت سے اکثر پھول موسمی تھے۔ چالیس سے زیادہ قسمیں گنی جا سکتی
تھیں۔ سب سے پہلے مارننگ گلوری (Morning Glory) نے اس
خرابۂ بے رنگ کو اپنی گل شگفتگیوں سے رنگین کیا۔ جب صبح کے وقت آسمان
پر سورج کی کرنیں مسکرانے لگتیں تو زمین پر مورننگ گلوری کی کلیاں کھِل کھِلا کر
ہنسنا شروع کر دیتیں۔ ابو طالب کلیم کو کیا خوب تمثیل سوجھی تھی:

شیرینیِ تبسمِ ہر غنچہ را مپرس
در شیرِ صبح خندۂ گُلہا شکر گزاشت!

کوئی پھول یاقوت کا کٹورا تھا۔ کوئی نیلم کی پیالی تھی۔ کسی پھول پر گنگا جمنی کی
قلم کاری کی گئی تھی۔ کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی۔
بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا صناعِ
قدرت کے مو قلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا۔ صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا،

اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں:

تکلّف سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گُل میں گل بوٹا کہاں ہے؟

"گلوری" کا اُردو میں ترجمہ کیجیے تو بات بنتی نہیں۔ "اجلالِ صبح" وغیرہ کہہ سکتے ہیں لیکن ذوقِ سلیم حرف گیری کرتا ہے۔ اس لیے میں مارننگ گلوری کو "بہارِ صبح" کے نام سے پکارتا ہوں:

یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا!

بہارِ صبح کی بیلیں برآمدے کی چھت تک پہنچا کر پھر اندر کی طرف پھیلا دی گئی تھیں۔ چند دنوں کے بعد نظر اُٹھائی تو ساری چھت پر پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں پھیل گئی تھیں۔ لوگ پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں اور اپنی کروٹوں سے اُسے پامال کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے حصے میں کانٹوں کا فرش آیا تو ہم نے اپنی پھولوں کی سیج بستر سے اُٹھا کر چھت پر اُلٹ دی۔ تلوؤں کے کانٹے چبھتے رہتے ہیں مگر نگاہ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتی ہے:

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی!

سامنے دو تختوں میں زینیا (Zinnia) کے پھول رنگ برنگ کے صافے باندھے نمودار ہو گئے۔ زینیا کے پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے زینیا کے پھول تھے۔ ان کے صافوں کی لپیٹ اتنی مرتب اور مدوّر واقع

ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، کسی مشاق دستار بند نے قالب پر چڑھا کر پیچوں کی ایک ایک سلوٹ نکال دی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، صافوں کی ضخامت بھی بڑھتی گئی، اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا، جیسے پہرہ داروں کی صفیں رنگ برنگ کی پگڑیاں باندھے کھڑی ہیں، اور زندانیانِ قلعہ کی طرح اس باغِ نو رستہ کی بھی پاسبانی ہو رہی ہے:

کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا!

ان تختوں کے درمیان گُل خطمی یعنے ہالی ہاک (Hollyhock) کا حلقہ تھا۔ یہ رنگ برنگ کے وائن گلاس ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے ہر شاخ اتنے گلاس سنبھالے ہوئی تھی کہ دل اندیشہ ناک رہتا، کہیں ایسا نہ ہو، ہوا کے جھونکوں کی ٹھوکر لگے اور گلاس گر کر چور چور ہو جائیں۔ دانش مشہدی نے غالباً انھی پھولوں کی ایک شاخ دیکھ کر کہا تھا:

دیدہ ام شاخِ گلے، بر خویش می پیچم کہ کاش
می توانستم بہ یک دست این قدر ساغر گرفت!

تخیل دراصل امیر خسرو سے ماخوذ ہے، جس نے اسی زمین میں کہا تھا:

ہست صحرا چوں کفِ دست، بر داز لالہ جام
خوش کفِ دستے کہ چندیں جامِ صہبا بر گرفت!

گُل خطمی کے پھولوں کی تشبیہ کتنی ہی دلکش ہو، مگر یہ ماننا پڑیگا کہ حسنِ نزاکت کی

ادائیں یہاں نہیں مل سکتیں۔ گلاس خوشنما ہیں مگر نازک نہیں ہیں۔ پٹونیا (Petunia) نے بھی میدان کے ہر گوشے کو دامنِ رنگیں بنا دیا تھا لیکن اُس کی رنگتوں کی سادگی سے تخیّل کی پیاس کہاں بجھ سکتی تھی؟ میدان کے وسط میں جھنڈے کے چبوترے کے دونوں طرف اسٹر (Aster) کارن فلاور (Cornflawer) سویٹ پیس (Sweet peas) کوکنار (Poppy) فلکس (Phlax) کلیوپسیس (Calliopsis) اور کاسمس (Cosmas) کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ نکل آئے تھے۔ گویا میدان کی کمر میں بوقلموں رنگوں کا ایک پٹکہ بندھ گیا تھا۔ لیکن وہ بھی چشمِ تماشائی کا سامانِ دید تھا، اہلِ بینش کے لیے ذوقِ نظر کا سامان نہ تھا۔ حالانکہ:

بزم میں اہلِ نظر بھی تھے، تماشائی بھی!

اس غرض کے لئے پنکس (Pinks) سلویا (Salvia) اور پینزی (Pansy) وغیرہ کے تختوں کا رُخ کرنا پڑتا تھا جن کی جلوہ فروشیاں ہر دم دیدۂ و دل کو دعوتِ نظّارہ دیتی رہتی تھیں۔ قدرت کے قلمِ صنعت کی یہ بھی ایک عجیب کرشمہ سنجی ہے کہ پھولوں کے ورق اور تتلیوں کے پروں پر ایک ہی موقلم سے مینا کاری کر دی اور ایک ہی رنگ کی دواتیں کام میں لائی گئیں۔ ان پھولوں کے اوراق کا مطالعہ کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے بڑے پھولوں کی کترن سے کچھ کاغذ بچ رہا تھا۔ اُسے بھی ضائع نہیں کیا گیا، اور قینچی سے تراش تراش کر تتلیے

ننھے پھولوں کے ورق بنا لیے۔ اگر ایک چیز نازک اور خوبصورت ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں، یہ پھول ہے۔ لیکن اگر خود پھولوں کے لیے کچھ کہنا چاہیں تو انہیں کس چیز سے تشبیہ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ زبانِ درماندہ کو یہاں یارائے سخن نہیں، اور خاموشی کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ حسن کی جلوہ طرازیاں محویت کا پیام ہوتی ہیں۔ خامہ فرسائی اور سخن آرائی کا تقاضہ نہیں ہوتا:

ازنگہ چشم تہی گشت و تماشا ماندہ ست
درزبان حرف نماندہ ست و سخنہا ماندہ ست!

ان پھولوں کو موسمی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے۔ ادھر موسم ختم ہوا، اُدھر اُنہوں نے بھی دنیا کو خیرباد کہدیا۔ گویا زندگی کا ایک ہی پیراہن ان کے حصے میں آیا تھا، وہی کفن کا بھی کام دے گیا:

ہمچو ماہی غیر داغم پوششِ دیگر نہ بود
تا کفن آمد، ہمیں یک جامہ برتن داشتم!

میر مبارک اللہ واضح عالمگیری کو بھی خیال پانی کا بلبلہ دیکھ کر ہوا تھا۔ دیکھیے کیا خوب کہہ گیا ہے:

رشک فرمائے دلم نیست بجز عیشِ حباب
یافت یک پیرہنِ ہستی و آں ہم کفن ست!

بہار میں پھولوں سے درخت لد جاتے ہیں۔ خزاں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر جونہی موسم کا دور پلٹتا ہے، دوبارہ آ موجود ہوتے ہیں۔ مگر موسمی پھولوں کے پودوں کا شیوۂ یک رنگی و یک ساختگی دیکھیے، کہ جب ایک مرتبہ دنیا کو پیٹھ دکھا دی تو پھر دوبارہ مُڑ کے دیکھنا نہیں چاہتے۔ گویا ابوطالب کلیم کا اشارہ انہی کی طرف تھا:

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رُو پس نہ کرد، ہر کہ ازیں خاکداں گزشت!

پھولوں کے جمالیاتی (Aesthetics) منظر سے اگر نظر ہٹائیے تو پھر ایک اور گوشہ سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ان کی عجائب آفرینیوں کا گوشہ ہے۔ روحِ نباتی بھی روحِ حیوانی کی طرح قسم قسم کے جسموں میں اُبھرتی ہے اور طرح طرح کے افعال و خواص کی نمائش کرتی رہتی ہے۔ یہ کہیں سوئی ہوئی دکھائی دیتی ہے، کہیں کروٹ بدلنے لگتی ہے، اور پھر کہیں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہمارے اس چھوٹے سے گوشۂ چمن میں ابھی صرف ایک ہی پھول ایسا ہے جسے اس قسم کے غیر معمولی پھولوں میں سے شمار کیا جا سکتا ہے یعنے گلوری اوسا سپوپربا (Gloriosa Superba) اس کی پانچ جڑیں گملوں میں لگائی گئی تھیں۔ چار بار آور ہوئیں۔ اب ان کی شاخیں کلیوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ان کا پھول پہلے پنجے کی طرح کھلیگا، پھر پیار کی طرح اُلٹ جائیگا، پھر

فانوس کی طرح مدوّر ہونے لگیگا، پھر تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رُک جائیگا، اور پھر دیکھیے، تو جن منزلوں سے گزرتا ہوا آیا تھا، اُنھی منزلوں سے گزرتا ہوا اُلٹے پاؤں واپس ہونے لگیگا۔ واپسی میں پہلے فانوس کی اُٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائینگی۔ پھر اچانک یہ پیالہ اُلٹ جائیگا۔ گویا زندگی کے جامِ واژگوں میں اب کچھ باقی نہ رہا:

لیے بیٹھا ہے اِک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی!

ہر پھول کی آمد و رفت کی یہ مسافت دس سے بارہ دن کے اندر طے ہوا کرتی ہے۔ چھ دن آنے میں لگتے ہیں چھ واپسی میں، اور دراصل اس کا آنا بھی جانے ہی کے لیے ہوتا ہے:

ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی!

رنگت کے اعتبار سے بھی اس کی بوقلمونیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ کلیاں جب نمودار ہونگی تو ہلکے سبز رنگ کی ہونگی۔ پھر جوں جوں کھلنے کا وقت آنے لگیگا، زردی اُبھرنے لگیگی۔ اور پھر زردی بتدریج سُرخی مائل ہونا شروع ہو جائیگی۔ پہلے آدھا سُرخ آدھا زرد رہیگا۔ پھر زردی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگیگی اور پورا پھول سُرخ ہو کر سُرخ مرچ کی پھلیوں کی طرح چمکنے لگیگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کی نسل ہندوستان کی طرف منسوب کی جاتی ہے مگر یہاں اس کی شہرت نہیں:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

یہ پھول نباتات کی اُس قسم میں داخل ہے جسے اتحادِ تناسلی کے لیے خارج کی مداخلت مطلوب ہوتی ہے، اور کبھی ہوا کے جھونکوں سے اور کبھی تتلیوں اور مکھیوں کی نشست و برخاست سے فطرت یہ کام لے لیا کرتی ہے۔ اس پھول کا جزوِ رجولیت اُس کے انوثیت کے جُز سے اس طرح بے تعلق واقع ہوا ہے کہ جب تک خارج کا ہاتھ مادۂ تلقیح کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ نہ پہنچا دے، تلقیح کا عمل انجام نہیں پا سکتا۔ جن پھولوں کو یہ خارجی اعانت مل جاتی ہے وہ باردار ہو جاتے ہیں اور اپنا بیج چھوڑ جاتے ہیں۔ جنہیں نہیں ملتی بانجھ ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں۔ ان پودوں کے لیے تتلیوں کا ایک گروہ بروقت پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ اکثر پھول باردار ہو گئے۔

خیر، یہ چمن آرائی کا ذکر تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو بلا قصد اتنا طولانی ہو گیا۔ اب اصل حکایت کی طرف واپس ہونا چاہیے۔ فروری میں ابر و باد کی آمد و رفت سے موسم کا اُتار چڑھاؤ جاری رہا۔ مگر جونہی مہینا ختم ہونے پر آیا، موسم بہار کا پیش خیمہ پہنچ گیا یعنے معتدل ہواؤں کے جھونکے چلنے لگے۔ پھر ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ خراماں خراماں چلتی ہوئی خود بہار بھی آموجود ہوئی ہے، اور جوانانِ چمن نے اس کی خوش آمدید کا جشن منانا شروع کر دیا ہے:

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد   عالمِ پیر دگر بار جواں خواہد شد!

اُسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن دوپہر کے وقت کمرہ میں بیٹھا تھا کہ اچانک کیا سُنتا ہوں، بُلبل کی نواؤں کی صدائیں آرہی ہیں:

بازنوائے بُلبلاں عشقِ تو یاد می دہد
ہر کہ زعشق نیست خوش عمر بباد می دہد!

باہر نکل کر دیکھا تو خطمی کے شگفتہ پھولوں کے ہجوم میں ایک جوڑا بیٹھا ہے، اور گردن اُٹھائے نغمہ سنجی کر رہا ہے۔ بے اختیار خواجۂ شیراز کی غزل یاد آگئی:

صفیرِ مرغ برآمد، بطِ شراب کجاست
فغاں نہاد زبلبل "نقابِ گل کے درید"!

یہ علاقہ اگرچہ سرد سیر نہیں ہے لیکن چونکہ بلند سطح پر واقع ہوا ہے، اس لیے پہاڑی بُلبلوں سے خالی نہیں ہے۔ یہ بلبلیں اگرچہ سرد سیر ایران کی بلبلوں کی طرح ہزار داستاں نہیں ہوتیں لیکن رسیلے گلے کی ایک تان بھی کیا کم ہے۔ دوپہر کی چائے کا جو قیلولہ کے بعد پیتا ہوں، آخری فنجان باقی تھا۔ میں نے اُٹھایا اور اس نغمۂ عندلیب پر خالی کر دیا:

تو نیز بادہ بہ چنگ آرو راہِ صحرا گیر
کہ مُرغِ نغمہ سرا سازِ خوش نوا آورد!

دوسرے دن صبح برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ بُلبل کے ترانے کی آواز پھر اُٹھی۔ میں نے ایک صاحب کو توجہ دلائی کہ سُنئے بُلبل کی آواز آرہی ہے۔ ایک دوسرے صاحب

جو صحن میں ٹہل رہے تھے کچھ دیر کے لیے رُک گئے اور کان لگا کر سُنتے رہے پھر بولے کہ ہاں، قلعہ میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے۔ اُس کے پہیوں کی آواز آ رہی ہے۔ سبحان اللہ! ذوقِ سماع کی دقّتِ امتیاز دیکھیے۔ بلبل کی نواؤں اور چھکڑے کے پہیوں کی ریں ریں میں یہاں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا:

ہمائے، گو مفگن سایۂ شرف ہرگز

دراں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد!

خدارا انصاف کیجیے، اگر دو ایسے کان ایک قفس میں بند کر دیے جائیں کہ ایک میں تو بلبل کی نوائیں بسی ہوں، دوسرے میں چھکڑے کے پہیوں کی ریں ریں، تو آپ اسے کیا کہینگے؟

نوائے بلبلت اے گل کجا پسند افتد

کہ گوشِ ہوش بہ فرمان ہرزہ گو داری!

اصل یہ ہے کہ ہر ملک کی فضا طبیعتوں میں ایک خاص طرح کا طبعی ذوق پیدا کر دیا کرتی ہے۔ ہندوستان کا عام طبعی ذوق بلبل کی نواؤں سے آشنا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ملک کی فضا دوسری طرح کی صداؤں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں کے پرندوں کی شہرت طوطا اور مینا کے پروں سے اُڑی اور دنیا کے عجائب میں سے شمار کی گئی:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند   زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

بلبل کی جگہ یہاں کوئل کی صدائیں شاعری کے کام آئیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس کی کوک دردآشنا دلوں کو غم والم کی چیخوں سے کم محسوس نہیں ہوتی۔

بلبل کی نواؤں کا ذوق تو ایران کے حصے میں آیا ہے۔ موسمِ بہار میں باغ و صحرا ہی نہیں بلکہ ہر گھر کا پائیں باغ ان کی نواؤں سے گونج اٹھتا ہے۔ بچے جھولے میں اُن کی لوریاں سُنتے سُنتے سو جائینگے اور مائیں اشارہ کرکے بتلائینگی کہ دیکھو یہ بلبل ہے جو تجھے اپنی کہانی سُنارہی ہے۔ جنوب سے شمال کی طرف جس قدر بڑھتے جائیں، یہ افسونِ فطرت بھی زیادہ عام اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایک شخص نے شیراز یا قزوین کے گل گشتوں کی سیر نہ کی ہو، وہ سمجھ نہیں سکتا کہ حافظ کی زبان سے یہ شعر کس عالم میں ٹپکے تھے:

بلبل بہ شاخِ سرو بہ گلبانگ پہلوی — می خواند دوش درسِ مقاماتِ معنوی

یعنے بیا، کہ آتش موسیٰ نمود گل — تا از درخت نکتۂ تحقیق بشنوی

مرغانِ باغ قافیہ سنجند و بذلہ گو — تا خواجہ می خورد بہ غزلہائے پہلوی

یہ جو کہا کہ مرغانِ باغ "قافیہ سنجی" کرتے ہیں، تو یہ مبالغہ نہیں ہے۔ واقعہ ہے میں نے ایران کے چمن زاروں میں ہزار کو قافیہ سنجی کرتے ہوئے خود سُنا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کے لَے بدلتی جائیگی، اور ہر لَے ایک ہی طرح کے اُتار پر ختم ہوگی جو سُننے میں ٹھیک ٹھیک شعروں کے قوافی کی طرح متوازن اور متجانس محسوس ہونگے۔ گھنٹوں سُنتے

رہے، ان قافیوں کا تسلسل ٹوٹنے والا نہیں۔ آواز جب ٹوٹیگی، ایک ہی قافیہ پر ٹوٹیگی!

حقیقت یہ ہے کہ نوائے بلبل بہشتِ بہار کا ملکوتی ترانہ ہے۔ جو ملک اس بہشت سے محروم ہے، وہ اس ترانے کے ذوق سے بھی محروم ہے۔ گرم ملکوں کو اس عالم کی کیا خبر؟ زمستاں کی برف باری اور پت جھڑ کے بعد جب موسم کا رُخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ و صحرا پر چھا جاتی ہے، تو اُس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکایک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہو گئی۔ انسان اپنے جسم کے اندر دیکھتا ہے، تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر اُبلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے تو فضا کا ایک ایک ذرہ عیش و نشاطِ ہستی کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی، آج آنکھیں کھولیے تو حسن کی عشوہ طرازی ہے، کان لگائیے تو نغمہ کی جاں نوازی ہے، سونگھیے تو سرتاسر بو کی عطر بیزی ہے!

صبا بہ تہنیت پیرِ مے فروش آمد — کہ موسم طرب و عیش ونائے و نوش آمد!
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کشا — درخت سبز شد و مُرغ در خروش آمد!
تنورِ لالہ چناں بر فروخت بادِ بہار — کہ غنچہ غرقِ عرق گشت و گل بجوش آمد!

عین جوش و سرمستی کی ان عالمگیریوں میں بلبل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے، اور یہ نغمہ سرائے بہشتی اس محویت اور خود رفتگی کے ساتھ گانے لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، خود سازِ فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے۔ اُس وقت انسانی احساسات میں جو تہلکہ مچنے لگتا ہے، ممکن نہیں کہ حرف و صوت سے ان کی تعبیر آشنا ہو سکے۔ شاعر پہلے مضطرب ہوگا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے۔ جب نہیں کھینچ سکیگا تو پھر خود اس کی تصویر بن جائیگا۔ وہ رنگ، بو، اور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھیگا۔ پھر کود پڑیگا، اور خود اپنی ہستی کو بھی اسی کی ایک موج بنا دیگا:

بیا تا گل بر افشانیم و می در ساغر اندازیم — فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم!
چو در دست است رودے خوش، بزن مطرب سرودے خوش — کہ دست افشاں غزل خوانیم و پا کوباں سر اندازیم!

ہندوستان میں صرف کشمیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس عالم کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی لیے فیضی کو کہنا پڑا تھا:

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن افسوس ہے، لوگوں کو پھل کھانے کا شوق ہوا۔ عالم بہار کی جنت نگاہیوں کا شوق نہ ہوا۔ کشمیر جائینگے بھی تو بہار کے موسم میں نہیں۔ بارش کے بعد پھلوں کے موسم میں۔ معلوم نہیں دنیا اپنی ہر بات میں اتنی شکم پرست کیوں ہو گئی ہے؟!

حالانکہ انسان کو معدہ کے ساتھ دل و دماغ بھی دیا گیا تھا!

ہندوستان کے پہاڑوں میں پہاڑی بلبل کا ترنم نینی تال اور کانگڑہ میں زیادہ سُنا جا سکتا ہے۔ مسوری اور شملہ کی چٹانی فضا اس کے لیے کافی کشش پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

ہندوستان میں عام طور پر چار قسم کی بلبلیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوش نوا قسم وہ ہے جس کے چہرے کے دونوں طرف سفید بوٹے ہوتے ہیں اور اس لیے آج کل نیچرل ہسٹری کی تقسیم میں اسے وہائٹ چیکڈ White Cheeked کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ شاما کو اگرچہ عام طور پر بلبل نہیں سمجھا جاتا لیکن اسے بھی میدانی سرزمینوں کا بلبل ہی تصور کرنا چاہیے۔ مغربی یوپی اور پنجاب میں اس کی متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں۔

اس وقت تک بلبل کے تین جوڑے یہاں دکھائی دیے ہیں۔ تینوں معمولی پہاڑی قسم کے ہیں جنہیں انگریزی میں White Whiskered کے نام سے پکارتے ہیں۔ ایک نے تو پھول کی ایک بیل میں آشیانہ بھی بنا لیا ہے۔ دوپہر کو پہلے بالکل خاموشی رہیگی۔ پھر جونہی میں کچھ دیر لیٹنے کے بعد اُٹھونگا اور لکھنے کے لیے بیٹھونگا، معاً ان کی نوائیں شروع ہو جائینگی۔ گویا اُنہیں معلوم ہو گیا ہے کہ یہی وقت ہے، جب ایک ہم صفیر اپنے دل و جگر کے زخموں کی پٹیاں کھولتا ہے۔ اس لیے نالہ و فریاد کے بے ہم چہرے لگانا شروع کر دیں۔ میرا وہی حال ہوا جو عربی کے ایک شاعر

کا ہوا تھا:

ومما شجانی اننی کنت نائمًا — اعلّل من بردٍ بطیب التنسّم
الی ان دعت ورقاء من غصن ایکۃ — تفرّد مبکاھا بحسن الترنّم
فلو قبل مبکاھا بکیت صبابۃً — بسعدیٰ شفیت النفس قبل التندّم
ولکن بکت قبلی فھیّج لی البکاء — بکاھا، فقلت الفضل للمتقدّم[1]!

---

[1] "اور جس بات نے مجھے غمگین کیا، وہ یہ ہے کہ جبکہ میں سو رہا تھا اور میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا، تو اچانک ایک خوش آواز پرندنے درختوں کے جھنڈ میں ترانہ سنجی شروع کردی۔ اُس کی رونے کی آواز اپنے ترنم کی خوبی میں آپ ہی اپنی مثال تھی۔ اگر اس کے رونے سے پہلے میں نے سُعدیٰ کے عشق میں چند آنسو بہا دیے ہوتے تو میرے حصہ میں شرمندگی نہ آتی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں ایسا نہ کرسکا؛ اور یہ اُس پرند کا رونا تھا جس سے میرے اندر بھی گریۂ و زاری کا جوش اُمنڈ آیا۔ پس مجھے شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلاشبہ یہاں فضیلت اُسی کے لیے ہوئی، جس نے پہلا قدم اُٹھایا"!

چڑیا چڑے کی کہانی

قلعۂ احمد نگر

۱۷ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں۔ خود زندگی ایسی گزری، جیسے ایک کہانی ہو:

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی!

آئیے آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں:

درہا شنیدستی، ایں ہم شنو!

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ دن بھر ان کا ہنگامۂ تگ و دو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا علاقہ چونکہ کھلا اور درختوں سے بھرا ہے، اس لیے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کارنسوں پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں

کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آگئی:

اُگ رہا ہے درو دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے!

گزشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشاں کر دیا تھا۔ کمرہ کے مشرقی گوشہ میں مُنہ دھونے کی ٹیبل لگی ہے۔ ٹھیک اس کے اوپر نہیں معلوم کب سے ایک پُرانا گھونسلا تعمیر پا چکا تھا۔ دن بھر میدان سے تنکے چن چن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پر گر کے اسے کوڑے کرکٹ سے اٹ دیتے۔ ادھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا، اُدھر تنکوں کی بارش شروع ہوگئی۔ پچھم کی طرف چارپائی دیوار سے لگی تھی۔ اس کے اوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کر دینے والا تھا۔ اِن چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں، لیکن طلب و سعی کا جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفارت کھود کے صاف کر دینگی۔ حکیم ارشمیدس (Archimedes) کا مقولہ مشہور ہے Dos moi pou sto kai ten gen kin eso مجھے فضا میں کھڑے ہونے کی جگہ دیدو میں کرۂ ارضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دونگا۔ اس دعوے کی تصدیق اِن چڑیوں کی سرگرمیاں دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنا لینگی کہ

پنجے ٹیکنے کا سہارا نکل آئے۔ پھر اُس پر پنجے جما کر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کر دیگی، اور اس زور سے چلائیگی کہ سارا جسم سکڑ سکڑ کر کانپنے لگیگا، اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے تو کئی انچ کلغانات اُدھڑ چکی ہوگی۔ مکان چونکہ پُرانا ہے، اس لیے نہیں معلوم، کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں۔ اب مِل مِلا کر تعمیری مسالہ کا ایک موٹا سا دل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا ہے، اور کپڑوں کو دیکھیے تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں!

اس مصیبت کا علاج بہت سہل تھا۔ یعنے مکان کی از سرِ نو مرمت کر دی جائے اور تمام گھونسلے بند کر دیے جائیں، لیکن مرمت بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ معمار بُلائے جائیں، اور یہاں باہر کا کوئی آدمی اندر قدم رکھ نہیں سکتا۔ یہاں ہمارے آتے ہی پانی کے نل بگڑ گئے تھے۔ ایک معمولی مستری کا کام تھا، لیکن جب تک ایک انگریزی فوجی انجنیر کمانڈنگ افیسر کا پروانہ راہداری لے کر نہیں آیا ان کی مرمت نہ ہو سکی۔

چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا، لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا، اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں:

من و گرز و میدان و افراسیاب!

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آگئی ہے۔ میں نے اُٹھائی اور اعلانِ جنگ

کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا، کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا:

خیالِ قدِ بلند تو می کند دلِ من
تو دستِ کوتہِ من بین و آستینِ دراز!

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برامدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اُسے اُٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرہ میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اُٹھائے دیوانہ وار اُس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے:

بہ خنجر زمیں را میستان کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم!

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا، اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا:

بہ یک تاختن تا کجا تاختم
چہ گردن کشاں را سر انداختم!

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں پر فتح مندانہ نظر ڈالی، اور مطمئن ہو کر لکھنے میں

مشغول ہوگیا۔ لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی پورے نہیں گزرے ہونگے کہ کیا سنتا ہوں۔ حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہوا پیمائیوں کی آوازیں پھر اُٹھ رہی ہیں۔ سر اُٹھا کے جو دیکھا تو چھت کا ہر گوشہ اُن کے قبضہ میں تھا۔ میں فوراً اُٹھا اور بانس لا کر پھر معرکۂ کارزار گرم کر دیا:

برارم دمار از ہمہ لشکرش
بر آتش بسوزم ہمہ کشورش!

اس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکھائی۔ ایک گوشہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے تو دوسرے میں ڈٹ جاتے، لیکن بالآخر میدان کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرہ سے بھاگ کر برآمدہ میں آئے اور وہاں اپنا لاؤ لشکر نئے سرے سے جمانے لگے۔ میں نے وہاں بھی تعاقب کیا، اور اُس وقت تک ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے بہت دور تک میدان صاف نہیں ہوگیا تھا۔

اب دشمن کی فوج تتر بتر ہوگئی تھی۔ مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہو کر میدان کا رُخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزہ کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھا گئی ہے۔ جس طرف رُخ کرتا تھا، اُسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھتے تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصہ تک اسے کمرہ ہی میں رہنے دیا جائے۔ اگر کسی اکّا دُکّا حریف نے رُخ کرنے کی جرأت بھی کی، تو یہ سر بفلک نیزہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہو جائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا

گیا۔ سب سے پرانا گھونسلا منہ دھونے کی ٹیبل کے اوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کر دیا گیا کہ اُس کا سرا ٹھیک ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سرو سامانِ جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ میرؔ کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے تاہم موقعہ کا تقاضہ ٹالا بھی نہیں جا سکتا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

اب گیارہ بج رہے تھے۔ میں کھانے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرہ میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ پھر حریف کے قبضہ میں ہے اور اس اطمینان و فراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں جیسے کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا، وہی حریفوں کی کامجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا، گھونسلے میں جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دینے لگا ہے۔ تنکے چن چن کر لاتے ہیں، اور اس نو تعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینان تمام گھونسلے میں پھیلاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں یہ مصرعہ گنگنا رہے ہوں کہ:

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد!

اپنی وہمی فتح مندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمت نے جواب دے دیا۔ صاف نظر آ گیا کہ چند لمحوں کے لیے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے مگر اُن کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں، اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا:

بیا، کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ ست!

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم وراہ اختیار کرنی چاہیے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک گھر میں گزارا ہو سکے۔ سب سے پہلے چارپائی کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ بالکل نئی تعمیرات کی زد میں تھی۔ پُرانی عمارت کے گرنے اور نئی تعمیروں کے سروسامان سے جس قدر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا، سب کا سب اسی پر گرتا۔ اس لیے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہِ راست زد میں نہ رہے۔ اس تبدیلی سے کمرہ کی شکل ضرور بگڑ گئی، لیکن اب اس کا علاج ہی کیا تھا؟ جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضہ میں نہ رہا تو پھر شکل و ترتیب کی آرائشوں کی کسے فکر ہو سکتی تھی؟ البتہ مُنہ دھونے کے ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا، صرف وہی جگہ اس کے لیے نکل سکتی تھی۔ ذرا بھی اِدھر اُدھر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لیے اور ٹیبل کی ہر چیز پر ایک ایک جھاڑن ڈال دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اُنھیں اُٹھا کر جھاڑ دیتا اور پھر ڈال دیتا۔ ایک

جھاڑن اس غرض سے رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے۔
سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا۔ لیکن اسے بھی کسی نہ کسی
طرح حل کیا گیا۔ یہ بات طے کرلی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی
کمرے میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہیے۔ ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ
میں چھپا دیا۔ کبھی دن میں دو مرتبہ، کبھی تین مرتبہ، کبھی اس سے بھی زیادہ اس سے
کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی
کے لیے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لیے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا،
اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پر اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا۔ اس لیے یہ طریقہ
اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھا لیا، اور ہم سایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار
ہاتھ مار دیے۔ دیکھیے، ان ناخواندہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کہاں تک کرنی
پڑی:

عشق ازیں بسیار کردست و کند!

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہو گئی تو چاہیے کہ پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک
نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں، اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے
سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا، اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں، اس کے سامنے
کی دری پر چند دانے چھٹک دیے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا، جیسے ایک
شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھیے، عرفی کا شعر صورتِ حال پر کیسا چسپاں

ہوا ہے:

فتادم دام بر کنجشک و شادم، یاد آں ہمت

کہ گر سیمرغ می آمد بدام، آزاد می کردم!

کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی۔ اور اگر ہوئی بھی تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ لیکن پھر صاف نظر آگیا کہ معشوقانِ ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے، ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے داتوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے:

حورِ جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہِ دوست

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را!

پہلے ایک چڑیا آئی اور ادھر اُدھر کودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ وحشی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے:

چہ لطف ہا کہ درین شیوۂ نہانی نیست

عنایتے کہ تو داری بمن، بیانی نیست

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی۔ کبھی دانوں پر نظر پڑتی۔ کبھی دانہ ڈالنے والے پر۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے۔ کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہ ہوں

سے دیکھتی ہے تو اُس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اُٹھا کے سامنے کی طرف دیکھیگی۔ پھر گردن موڑ کے دہنے بائیں دیکھنے لگیگی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اُٹھائیگی، اور چہرے پر تفحص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائیگا، جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا؟ اور ہو کیا رہا ہے؟ ایسی ہی متفحص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرہ پر اُبھر رہی تھیں:

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نہ می رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست؟

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے لیکن براہِ راست دانوں کی طرف نہیں۔ آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغِ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر بے اختیار ظہوری کا شعر یاد آگیا:

بگو حدیثِ وفا، از تو باور ست، بگو
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند ست

آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ جونہی اُن کے قدموں کا رُخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا، نگاہیں دوسری طرف کر لیں، اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس و حرکت بنا لیا۔ گویا آدمی کی جگہ پتھر کی

ایک مورتی دھری ہے۔ کیونکہ جانتا تھا، اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی، تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائیگا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا:

نہاں از و بہ رخش داشتم تماشائے
نظر بہ جانب ما کرد و شرمسار شدم

خیر، خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے، اور ایک بت طناز نے صاف صاف دانوں کی طرف رُخ کیا۔ مگر یہ رُخ بھی کیا قیامت کا رُخ تھا۔ ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

بہ ہر کجا ناز سر برآرد، نیاز ہم پائے کم ندارد
تو و خرامے و صد تغافل، من و نگاہے و صد تمنا!

ایک قدم آگے بڑھتا تھا تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات و تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جا سکتی۔ دو قدم آگے بڑھتے۔ ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا!

التفات و تغافل کی اِن عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جرأتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلۂ کار کی درازی سے اُکتا کر بے باکانہ قدم اُٹھا دیا، اور زبانِ حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا، بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا کہ:

زدیم بر صفِ رنداں و ہرچہ بادا باد!

اس ایک قدم کا اُٹھنا تھا کہ معلوم ہوا، جیسے اچانک تمام رُکے ہوئے قدموں کے بندھن کھُل پڑے۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب۔ مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا، اور اگر انگریزی محاورہ کی تعبیر مستعار لی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حجاب و تامّل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی۔ یا یوں کہیے کہ پگھل گئی۔ غور کیجیے، تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشہ کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اُٹھتا، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں۔ یہ اُٹھا، اور گویا ساری دنیا اچانک اُٹھ گئی:

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد!

اس بزمِ سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ اُنھی کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر اُٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بے باکانہ اقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا کہ اُسی وقت دِل نے ٹھان لی، اس مردکار سے رسم و راہ بڑھانی چاہیے۔ میں نے اُس کا نام قلندر رکھ دیا۔ کیونکہ بے دماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا، اور اُس کی وضعِ قلندرانہ کو آب و تاب دے رہا تھا:

رہے اک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چینِ ابرو پر ادائے کج کُلاہی کو!

دو تین دن تک اسی طرح ان کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے، اور ایک ایک دانہ چُن لیتے۔ کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہو جاتی تو قلندر آ کر چوں چوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقتِ معہود گزر رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے اب اطمینان دِلا دیا تھا کہ پردۂ حجاب اُٹھ چکا۔ وہ وقت دور نہیں کہ رہی سہی جھجک بھی نکل جائیگی:

اور کھُل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں!

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا قدم اُٹھایا۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا۔ اس میں چاول کے دانے ڈالے، اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آ کر منہ مارنے لگا، کوئی

ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمعیتِ خاطر کے ساتھ چگنے میں مشغول ہو گیا۔ آپس میں رقیبانہ ردّ و کد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریقِ ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہو گئی ہیں، تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا، تیسرے دن اور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بُعد سے قُرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ دیکھیے، بُعد و قرب کے معاملہ نے عالیہ بنت المہدی کا مطلع یاد دلادیا:

وحبّب، فان الحبّ داعیۃ الحب

وکم من بعید الدار تستوجب القرب!

اتنا قرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامّل ہوا۔ دری کے پاس آ گئے مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا لیکن اتنے میں قلندر اپنے قلندرانہ نعرے لگاتا ہوا آپہنچا، اور اس کی رندانہ جرأتیں دیکھ کر سب کی جھجک دور ہو گئی۔ گویا اس راہ میں سب قلندر ہی کے پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اُٹھا، سب کے اُٹھ گئے۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا، پھر سر اُٹھا کے اور سینہ تان کے زبانِ حال سے مترنّم ہوتا:

وما الدھر الا من رواۃ قصائدی

اذا قلتُ شعراً، اصبح الدھر منشداً!

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو پھر ایک قدم اور اُٹھایا گیا، اور دانوں کا برتن

دری سے اٹھا کے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے، اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بار بار آتے، اور تپائی کا چکر لگا کے چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر رہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا، اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوانِ طرب بنتی۔ کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔

جب اس قدر نزدیک آجانے کے خوگر ہو گئے تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایک دن صبح یہ کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہو گیا گویا اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں:

دل و جانم بہ تو مشغول و نظر در چپ و راست
تا نہ دانند رقیباں کہ تو منظورِ منی!

تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آرہی ہے۔ کنکھیوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا، اس لیے اس کی دم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یارانِ تیز گام بھی پہنچ گئے اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقۂ بے تکلف میرے بغل میں

اُچھل کود کرتا رہتا۔ کبھی کوئی صوفے کی پشت پر چڑھ جاتا، کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اُتر آتا اور چُوں چُوں کر کے پھر واپس آ جاتا۔ بے تکلفی کی اس اُچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جُھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست وخیز کا نشانہ بنانا چاہا، لیکن پھر جِھجک کر پلٹ گئے، یا پنجوں سے اُسے چھُوا اور اوپر ہی اوپر نکل گئے۔ گویا ابھی معاملہ اُس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا، جس کا نقشہ وحشی یزدی نے کھینچا ہے:

هنوز عاشقی و دلربایی نه شده است — هنوز زوری و مرد آزمایی نه شده است

همیں تواضع عام ست حسن را با عشق — میانِ ناز و نیاز آشنایی نه شده است

بہرحال رفتہ رفتہ ان آہوانِ ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھیے، محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کر سکتا، وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے:

درسِ وفا اگر بود زمزمۂ محبتے

جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں۔ اتنے میں کوئی دلنشین بات نوکِ قلم پر آ گئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُرکیف شعر یاد دلا دیا، اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا، یا مُنہ سے "ہا" نکل گیا، اور یکایک زور سے پروں کے اُڑنے کی

ایک پھڑسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں، تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلّف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامّل اپنی اُچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک اُنھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اُڑ گئے۔ عجب نہیں، اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے!

قلعۂ احمد نگر

۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم - کل جو کہانی شروع ہوئی تھی، وہ ابھی ختم کہاں ہوئی؟ آئیے، آج آپ کو اس "منطق الطیر" کا ایک دوسرا باب سناؤں۔ معلوم نہیں، اگر آپ سنتے ہوتے تو شوق ظاہر کرتے یا اُکتا جاتے؛ لیکن اپنی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے داستانسرائیوں سے تھکنا بالکل بھول گئی ہو۔ داستانیں جتنی پھیلتی جاتی ہیں، ذوقِ داستانسرائی بھی اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے:

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے

تا با تو حکایت کنم از ہر بابے!

ان یارانِ سقف و محاریب میں اور مجھ میں اب خوف و تذبذب کا ایک ہلکا سا پردہ حائل رہ گیا تھا۔ چند دنوں میں وہ بھی اُٹھ گیا۔

اُنہیں چھت سے صوفے پر اُترنے کے لیے چند درمیانی منزلوں کی ضرورت تھی۔ اب یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ پہلی منزل کا کام پنکھے کے دستوں سے لیتے، اور دوسری کا میرے سر اور کاندھوں سے۔ باہر سے اُڑتے ہوئے کمرے میں آئے اور سیدھے اپنے گھونسلے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے سر نکال کر ہر طرف نظر دوڑائی اور پورے کمرہ کا جائزہ لے لیا۔ پھر وہاں سے اُڑے اور سیدھے

پنکھے کے دستے پر پہنچ گئے۔ پھر دستے سے جو کودے، تو کبھی میرے سر کو اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا، کبھی کاندھوں کو اپنے جلوس سے عزت بخشی۔ دیکھیے، ان چڑیوں نے نہیں معلوم کتنے برسوں کے بعد مومن خاں کا ترکیب بند یاد دلا دیا:-

جولاں کو ہے اُس کی قصدِ پامال

اے خاک! نویدِ سرفرازی!

پہلی دفعہ تو اس ناگہانی نزولِ اجلال نے مجھے چونکا دیا تھا اور شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چونک کر ہل گیا تھا۔ قدرتی طور پر ان آشنایانِ زود گسل پر یہ ناقدرشناسی گراں گزری ہوگی۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا، محض ایک اضطراری سہو تھا طبیعت فوراً متنبہ ہوگئی، اور پھر تو سر اور کاندھا کچھ ایسا بے حس ہو کر رہ گیا کہ منارہ کی چھتری کی جگہ بالا خانے کا کام دینے لگا۔ پنکھے سے اُتر کر سیدھے کاندھے پر پہنچتے، کچھ دیر چہچہاتے، اور پھر کود کر صوفے پر پہنچ جاتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کاندھے سے جست لگائی اور سر پر جا بیٹھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آتشی قندھاری نے اپنی آنکھوں کی کشتی بنائی تھی۔ بدایونی نے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے:

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن

بیا، در کشتیِ چشمم نشین و سیرِ دریا کن

اور ہمارے سودا کو تامل ہوا تھا:

آنکھوں میں دو دل اُس آئینہ رو کو جگہ، دے
ٹپکا کرے ہے بسکہ یہ گھر نم بہت ہی یاں

لیکن میری زبانِ حال کو شیخ شیراز کی التجائے نیاز مستعار لینی پڑی:

گر بر سرو چشمِ من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی!

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو خیال ہوا، اب ایک اور تجربہ بھی کیوں نہ کر لیا جائے؟ ایک دن صبح میں نے دانوں کا برتن کچھ دیر تک نہیں رکھا۔ مہمانانِ باصفا بار بار آئے، اور جب سفرۂ ضیافت دکھائی نہیں دیا تو اِدھر اُدھر چکر لگانے اور شور مچانے لگے۔ اب میں نے برتن نکال کے ہتیلی پر رکھ لیا اور ہتیلی صوفے پر رکھ دی۔ جونہی قلندر کی نظر پڑی، معاً جست لگائی، اور ایک چکر لگا کے انگوٹھے پر آ کھڑا ہوا، اور پھر تیزی کے ساتھ دانوں پر چونچ مارنے لگا۔ اس تیزی میں کچھ تو طبعِ قلندرانہ کا قدرتی تقاضہ تھا، اور کچھ یہ وجہ بھی ہوگی کہ دیر تک دانوں کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ چونچ کی تیز ضربوں سے دانے اُڑ اُڑ کر ڈھکنے سے باہر گرنے لگے۔ ایک دانہ انگلی کی جڑ کے پاس بھی گر گیا۔ اُس نے فوراً وہاں بھی ایک چونچ ماردی، اور ایسی خارا شگاف ماری کہ کیا کہوں، اگر ستم پیشوں کے جور و جفا کا خوگر نہ ہو چکا ہوتا، تو یقین کیجیے، بے اختیار منہ سے چیخ نکل جاتی:

من گشتۂ کرشمۂ مژگاں کہ بر جگر خنجر زد آں چناں کہ نگہ را خبر نہ شد!

اب میں نے ہتھیلی برتن سمیت اوپر اُٹھالی اور ہوا میں معلق کردی۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دوسری چڑیا آئی۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا نام موتی ہے۔ موتی نے ہتھیلی کے اوپر ایک دو چکر لگائے اور نکل گئی۔ گویا اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ اس جزیرہ پر اترنے کے لیے محفوظ جگہ کونسی ہوگی۔ پھر دوبارہ آئی اور کھنی کے پاس اُتر کر سیدھی پہنچے تک پہنچ گئی، اور پہنچے سے ہتھیلی کی خاکنائے پر اتر کر بے تکان منقار درازیاں شروع کردیں۔ اس میں کوئی دانہ قاب کے باہر گر گیا، تو چونچ کا ایک نشتر اس پر بھی لگا دیا۔ دیکھیے، "دست درازی" کی ترکیب میں تصرف کرکے مجھے "منقار درازی" کی ترکیب وضع کرنی پڑی۔ جانتا ہوں کہ محاورات میں تصرفات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر کیا کیا جائے، سابقہ ایسے یارانِ کوتہ آستین سے آپڑا جو ہاتھ کی جگہ منہ سے "دراز دستیاں" کرتے ہیں:

درازدستی ایں کوتہ آستیناں بیں!

لیکن اس آخری تجربے نے طبع کاوش پسند کو ایک دوسری ہی فکر میں ڈال دیا۔ ذوقِ عشق کی اس کوتاہی پر شرم آئی کہ ہتھیلی موجود ہے اور میں نامرادٹین کے ڈھکنے پر ان منقاروں کی نشتر زنی ضائع کر رہا ہوں۔ میں نے دوسرے دن ٹین کا ڈھکنا ہٹادیا۔ چاول کے دانے ہتھیلی پر رکھے، اور ہتھیلی پھیلا کر صفے پر رکھ دی۔ سب سے پہلے موتی آئی، اور گردن اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگی کہ آج ڈھکنا کیوں دکھائی نہیں دیتا؟ یہ اس بستی کی سب سے زیادہ خوبصورت چڑیا ہے آج

کل حسن کی نمائشوں میں خوبروئی اور دلاویزی کا جو فقرہ گر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے، اُسے پورے ملک کی نسبت سے موسوم کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً کہیں گے مس انگلینڈ۔ مادی موزیل (Mademoiselle) فرانس۔ گویا ایک حسین چہرے کے چمکنے سے سارے ملک و قوم کا چہرہ چمک اُٹھتا ہے:

کنند خویش و تبار از تو ناز و می زیبد
بہ حُسنِ یک تن اگر صد قبیلہ ناز کنند!

اگر یہ طریقہ موتی کے لیے کام میں لایا جائے تو اسے مادام قلعہ احمد نگر سے موسوم کر سکتے ہیں:

ایں نگاہیست کہ شائستۂ دیدارے ہست!

چھریرا بدن، نکلتی ہوئی گردن، مخروطی دُم، اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا بولتا ہوا بھولاپن۔ جب دانہ چگنے کے لیے آئیگی، تو ہر دانے پر میری طرف دیکھتی جائیگی۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں مگر نگاہیں گویا ہو گئی ہیں۔ وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے۔ میں نے اُس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ ہاں، وحشی یزدی نے ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہا ہے:

کرشمہ گرمِ سوال ست، لب مکن رنجہ
کہ احتیاج بہ پرسیدنِ زبانی نیست

بہر حال اس موقع پر بھی اُس کی بے ساختہ نگاہوں نے مجھ سے کچھ کہا، اور

پھر بغیر کسی جھجک کے جست لگا کے انگوٹھے کی جڑ پر آ کھڑی ہوئی، اور دانوں پر چونچ مارنا شروع کردیا۔ یہ چونچ نہیں تھی۔ نشتر کی نوک تھی، جو اگر چاہتی، تو ہتھیلی کے آر پار ہو جاتی، مگر صرف چرکے لگا لگا کے رُک جاتی تھی:

یک ناوکِ کاری زکمانِ تو نہ خوردم
ہر زخم تو محتاج بہ زخمِ دگرم کرد!

ہر مرتبہ گردن موڑ کے میری طرف دیکھتی بھی جاتی تھی۔ گویا پوچھ رہی تھی کہ درد تو نہیں ہو رہا؟ بھلا میں جاں باختۂ لذت الم اس کا کیا جواب دیتا؟

ایں سخن را چہ جواب ست، تو ہم میدانی!

مرزا صائب کا یہ شعر آپ کی نگاہوں سے گذرا ہوگا:

خویش را بر نوکِ مژگانِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل می خواست در خنجر نہ بود

مجھے اس میں اس قدر تصرف کرنا پڑا کہ مژگاں کی جگہ "منقار" کردیا:

خویش را بر نوک منقارِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل می خواست در خنجر نہ بود

درد کا حال تو معلوم نہیں، مگر چونچ کی ہر ضرب جو پڑتی تھی، ہتیلی کی سطح پر ایک گہرا زخم ڈال کے اُٹھتی تھی:

رسیدن ہائے منقارِ ہما بر استخواں غالبؔ پس از عمرے بیادم داد زخم ورہ پیکاں را

اِس بستی کے اگر عام باشندوں سے قطع نظر کرلی جائے، تو خواص میں چند شخصیتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ قلندر اور موتی سے آپ کی تقریب ہو چکی ہے۔ اب مختصراً مُلّا اور صوفی کا حال بھی سُن لیجیے۔ ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے۔ جب دیکھو، زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اُٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے۔ جو بھی سامنے آجائے دُو دُو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہیگا۔ کیا مجال کہ ہم سایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے۔ کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی لیکن پہلے ہی مقابلہ میں چت ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے، تو یہ سرِ و سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور دہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً آموجود ہوتا ہے، اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چُوں چاں، چُوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظ جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے:

دی واعظکے آمد در مسجد جامع — چوں برف ہمہ جامہ سپید از پا تا سر
چشمش بہ سوے چپ و چشمش بہ سوے راست — تا خود کہ سلامے کند از منعم و مضطر
زاں ساں کہ خرامد بہ رسن مرد رسن باز — آہستہ خرامیدی و موزون و موقّر
فارغ نہ شدہ خلق ز تسلیم و تشہد — بر جست چو بوزینہ و بنشست بہ منبر
وانگہ بہ سر و گردن و ریش و لب و بینی — بس عشوہ بیاورد و سخن کرد چنیں سر

فرمائیے، اگر اس کا نام مُلّا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا؟ ٹھیک اس کے برعکس ایک

دوسرا چڑا ہے۔ تعرف الاشیا باضدادہا۔ اسے جب دیکھیے، اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے:

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد!

بہت کیا، تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا سا نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے، جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو، اور کبھی کبھی سر اُٹھا کے "ہاں" کر دیتا ہو:

تا تو بیدار شوی، نالہ کشیدم، ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

دوسرے چڑے اُس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ گویا اُس کی کم سخنی سے عاجز آگئے ہیں۔ پھر بھی اُس کی زبان کھُلتی نہیں۔ البتہ نگاہوں پر کان لگائیے تو اُن کی صدائے خاموش سُنی جا سکتی ہے:

تو نظر باز نۂ، ورنہ تغافل نگہ ست!
تو زبان فہم نۂ، ورنہ خموشی سخن ست!

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تلقب:

جامۂ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود!

صبح جب اس بستی کے تمام باشندے باہر نکلتے ہیں تو برآمدہ اور میدان میں عجیب چہل پہل ہونے لگتی ہے۔ کوئی پھول کے گملوں پر کودتا پھرتا ہے۔

کوئی کروٹن کی شاخوں میں جھولا جھولنے لگتا ہے۔ ایک جوڑے نے غسل کا تہیہ کیا اور اس انتظار میں رہا کہ کب پھولوں کے تختوں میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ جونہی پانی ڈالا گیا، فوراً حوض میں اُتر گیا اور پروں کو تیزی کے ساتھ کھولنے اور بند کرنے لگا۔ ایک دوسرے جوڑے کو آس پاس پانی نہیں ملا، تو فتیمّموا صعیداً طیباً پڑھتا ہوا مٹی ہی میں نہانا شروع کر دیا۔ پہلے چونچ مار مار کے اتنی مٹی کھود ڈالی کہ سینے تک ڈوب سکے۔ پھر اس گڑھے میں بیٹھ کر اس طرح پاکوبیاں اور پرافشانیاں شروع کر دیں کہ گرد و خاک کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ فاصلہ پر ملّا حسب معمول کسی حریف سے کشتی لڑنے میں مشغول ہے۔ ان کے لڑنے کی خود فروشیوں کا بھی کچھ عجیب حال ہوتا ہے:

لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

یعنے ہاتھ کو دیکھیے تو ہتیار سے یک قلم خالی ہے، بلکہ سرے سے ہاتھ ہے ہی نہیں:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہو گریباں سے!

مگر چونچ کو دیکھیے تو سارے ہتیاروں کی کمی پوری کر رہی ہے۔ جوشِ غضب میں آکر اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائینگے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا دشوار ہو جائیگا۔ گویا "جدال سعدی با مدعی در بیان تونگری و درویشی" کا منظر آنکھوں میں پھر جائیگا:

او در من و من در و فتادہ!

ہوا میں جب کشتی لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں، تو انہیں اس کا بھی ہوش نہیں رہتا کہ کہاں گر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے سر پر گر پڑے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹھیک میری گود میں آکر پڑ گئے۔ میں نے ایک کو ایک ہاتھ سے دوسرے کو دوسرے سے پکڑ لیا:

میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے!

سارا جسم مٹھی میں بند تھا۔ صرف گردنیں نکلی ہوئی تھیں۔ دل اس زور سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا۔ اب پھٹا۔ اب پھٹا۔ لیکن اس پر بھی ایک دوسرے کو چونچ مارنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ جب میں نے مٹھیاں کھولدیں، تو پھر سے اُڑ کر پنکھے کے دستے پر جا بیٹھے، اور دیر تک چوں چوں کرتے رہے۔ غالباً ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ:

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت!

موتی کے گھونسلے سے ایک بچے کی آواز عرصہ سے آرہی تھی۔ وہ جب دانوں پر چونچ مارتی، تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی اور فوراً گھونسلے کا رُخ کرتی۔ وہاں اُس کے پہنچتے ہی بچے کا شور شروع ہو جاتا۔ ایک دو سکنڈ کے بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اُڑ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے گنا تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی۔

جن علماءِ علم الحیوان نے اس جنس کے پرندوں کے خصائص کا مطالعہ کیا ہے، اُن کا بیان ہے کہ ایک چڑیا دن بھر کے اندر ڈھائی سو سے تین سو مرتبہ تک بچے کو غذا دیتی ہے، اور اگر دن بھر کی مجموعی مقدارِ غذا بچے کے جسم کے مقابلہ میں رکھی جائے، تو اُس کا حجم (Mass) کسی طرح بھی بچے کے جسمانی حجم سے کم نہ ہوگا۔ مگر بچوں کی قوتِ ہاضمہ اس تیزی سے کام کرتی رہتی ہے کہ اِدھر دانہ اُن کے اندر گیا اور اُدھر تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پرندوں کے بچوں کے نشو و نما کا اوسط چارپایوں کے بچوں کے اوسط سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور بہت تھوڑی مدت کے اندر وہ بلوغ تک پہنچ جاتے ہیں۔ موتی کی رفتارِ عمل سے مجھے اس بیان کی پوری تصدیق مل گئی۔

— پھر جوں جوں بچوں کے پر بڑھنے لگتے ہیں، وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ماں کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب انہیں اُڑنے کا سبق سکھانا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے، موتی کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی۔ ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں، گھونسلے سے اُڑتی ہوئی اتری، تو اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا۔ موتی بار بار اُس کے پاس جاتی اور اُڑنے کا اشارہ کر کے اوپر کی طرف اُڑنے لگتی لیکن بچے میں اثر پذیری کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ پر پھیلائے، آنکھیں بند کیے، بے حس و حرکت پڑا تھا میں نے اُسے اُٹھا کے دیکھا تو معلوم ہوا، ابھی

پر پوری طرح بڑھے نہیں ہیں۔ گرنے کی چوٹ کا اثر بھی تازہ ہے اور اُس سے تے بے حال کر دیا ہے سبے اختیار نظیری کا شعر یاد آگیا:

بہ وصلش تا رسم، صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم

بہرحال اُسے اُٹھا کے دری پر رکھ دیا۔ موتی چاول کے ٹکڑے چُن چُن کر مُنہ میں لیتی اور اُسے کھلا دیتی۔ وہ مُنہ کھولتے ہوئے چوں چوں کی ایک مدھم اور اُکھڑی سی آواز نکال دیتا، اور پھر دم بخود، آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔ پورا دن اسی حالت میں نکل گیا۔ دوسرے دن بھی اس کی حالت ویسی ہی رہی۔ ماں صبح سے لے کر شام تک برابر اُڑنے کی تلقین کرتی رہی۔ مگر اس پر کچھ ایسی مُردنی سی چھا گئی تھی کہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اب بچےگا نہیں۔ لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دھوپ کی ایک لکیر کمرہ کے اندر دور تک چلی گئی تھی۔ یہ اُس میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پر گرے ہوئے، پانوں مُڑے ہوئے، آنکھیں حسبِ معمول بند تھیں۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے۔ پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر گرے ہوئے پروں کو سُکیڑ کر ایک، دو مرتبہ کھولا بند کیا، اور پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اُڑا، تو بہ یک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر ہوائی کی طرح فضا میں اُڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔

یہ منظر اس درجہ عجیب اور غیر متوقع تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی نگاہوں پر شبہ ہونے لگا۔ کہیں کسی دوسری چڑیا کو اُڑتے دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑ گیا ہوں، لیکن ایک واقعہ جو ظہور میں آ چکا تھا، اب اس میں شبہ کی گنجائش کہاں باقی رہی تھی؟ کہاں تو بے حالی اور درماندگی کی یہ حالت کہ دو دن تک ماں سر کھپاتی رہی مگر زمین سے بالشت بھر بھی اونچا نہ ہو سکا، اور کہاں آسمان پیمائیوں کا یہ انقلاب انگیز جوش کہ پہلی ہی اُڑان میں عالم حدود و قیود کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور فضائے لامتناہی کی ناپیدا کنار وسعتوں میں گم ہو گیا! کیا کہوں، اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کر دی تھی۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا تھا، اور اس جوش و خروش کے ساتھ آیا تھا کہ ہمسایے چونک اُٹھے تھے:

نیروئے عشق بیں کہ دریں دشتِ بیکراں
گامے نہ رفتہ ایم و بہ پایاں رسیدہ ایم!

دراصل یہ کچھ نہ تھا۔ زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا جو ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے مگر ہم اُسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس چڑیا کے بچے میں اُڑنے کی استعداد اُبھر چکی تھی۔ وہ اپنے کنج نشیمن سے نکل کر فضائے آسمانی کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ مگر ابھی تک اُس کی خود شناسی کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا۔ ماں بار بار اشارے کرتی تھی، ہوا کی لہریں بار بار پروں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں، زندگی

اور حرکت کا ہنگامہ ہر طرف سے آ آ کر بڑھا دے دیتا تھا لیکن اُس کے اندر کا چولھا کچھ اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ باہر کی کوئی گرمجوشی بھی اسے گرم نہیں کر سکتی تھی:

کلیم شکوہ ز توفیق چند؟ شرمت باد!
تو چوں برہ نہ نہی پائے، رہنما چہ کند؟

لیکن جونہی اُس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اُٹھی، اور اُسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ "میں اُڑنے والا پرند ہوں" اچانک قالبِ بے جان کی ہر چیز از سرِ نو جاندار بن گئی۔ وہی جسمِ زار جو بے طاقتی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اب سرو قد کھڑا تھا۔ وہی کانپتے ہوئے گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی سہار نہیں سکتے تھے، اب تن کر سیدھے ہو گئے تھے۔ وہی گرے ہوئے پر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی، اب سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوشِ پرواز کی ایک برق وار تڑپ نے اُس کا پورا جسم ہلا کر اچھال دیا۔ اور پھر جو دیکھا، تو درماندگی اور بے حالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے، اور مُرغِ ہمت، عقاب وار فضائے لاتناہی کی لاانتہائیوں کی پیمائش کر رہا تھا۔ ولِلّٰہِ درّ ما قال:

بال بکشا وُ صفیر از شجرِ طوبیٰ زن حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیرِ قفسی!

گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پر و بالی سے بلند پروازی،

اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجیے، تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے:

ع می شود ایں رہ بہ درخشیدنِ برقے ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم!

اُڑنے کے سروسامان میں سے کونسی چیز تھی جو اس نوگرفتارِ قفسِ حیات کے حصے میں نہیں آئی تھی؟ فطرت نے سارا سروسامان مہیا کر کے اسے بھیجا تھا، اور ماں کے اشارے دمبدم گرم پروازی کے لیے اُبھار رہے تھے۔ لیکن جب تک اُس کے اندر کی خود شناسی بیدار نہیں ہوئی، اور اس حقیقت کا عرفان نہیں ہوا کہ وہ طائرِ بلند پرواز ہے، اُس کے بال و پر کا سارا سروسامان بیکار رہا۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی خود شناسی بھی جب تک سوئی رہتی ہے، باہر کا کوئی ہنگامۂ سعی اسے بیدار نہیں کر سکتا۔ لیکن جونہی اس کے اندر کا عرفان جاگ اُٹھا، اور اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس کی چھپی ہوئی حقیقت کیا ہے، تو پھر چشم زدن کے اندر سارا انقلابِ حال انجام پا جاتا ہے، اور ایک ہی جست میں حضیضِ خاک سے اُڑ کر رفعتِ افلاک تک پہنچ جاتا ہے۔ خواجۂ شیراز نے اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا:

چہ گویمت کہ بہ میخانہ دوش مستِ خراب سروشِ عالمِ غیبم چہ مژدہ ہا داد ست

کہ "اے بلند نظر، شاہبازِ سدرہ نشیں! نشیمنِ تو نہ ایں کنجِ محنت آباد ست

ترا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد ست"

قلعۂ احمد نگر

۱۱۔ اپریل ۴۳ء

آنچہ دل از فکر آں می سوخت، بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بر آں ہم ساختیم!

صدیق مکرم اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں، بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسبِ معمول بستر پر لیٹ گیا تھا۔ لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا۔ کمرہ میں آیا۔ روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اُٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کر دوں۔ اِن آٹھ مہینوں میں جو یہاں گذر چکے ہیں یہ پہلی رات ہے جو اس طرح گذر رہی ہے اور نہیں معلوم اور کتنی راتیں اسی طرح گذرینگی:

دماغ بر فلک و دل بہ پائے مہر بتاں
چگونہ حرف زنم، دل کجا دماغ کجا؟

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا، تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویشِ خاطر کا موجب ہو گا۔ مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ زمانہ کم و بیش علالت

کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آرہی تھی۔

اس تمام زمانے میں مَیں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی:

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان نہیں آیا تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف اُمنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائیگا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائیگا[1]

---

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کرکے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لئے گئے تھے۔ لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا، وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اُس نے وقت کی صورتِ حال کا پُوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے، مَیں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقعہ بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ ایسی خاموشی میں خلل پڑے اس لئے وہ بھی خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سُن رہے تھے اور اُن کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳۔ اگست کو جب مَیں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ مَیں نے کہا، اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳۔ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اُس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا، لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اُس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا! اُس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا:

خود را بجیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم!

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں، لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اُس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اُس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اُسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اُس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اُس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اُس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اُس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب

پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۱ ستمبر کو مجھے اُس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشانِ خاطر کرنا پسند نہیں کریگی۔ اس لئے گھر کے بعض اور عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخِ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اِس لیئے کوئی بات جلد معلوم ہو نہیں سکتی۔ ۱۵۔ فروری کو مجھے ایک خط ۲۔ فروری کا بھیجا ہُوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ مَیں نے تار کے ذریعہ مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳۔ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اُسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا، اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیئے۔

چونکہ حکومت نے ہمارے قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے

اس لئے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام بھیجا جا سکتا ہے۔ نہ باہر سے کوئی آ سکتا ہے۔ کیونکہ اگر آئیگا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعہ آئیگا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائیگا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو، لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اُسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہئے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لئے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے، آگے نہ بڑھائی جائے چونکہ میری ڈاک دُوسری قسم میں داخل ہے۔ اس لئے مجھے کوئی تار بھی ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳۔ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا، اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورتِ حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے، اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دیگا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑیگی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متأثر تھا، اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن مَیں نے اُس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور اُن سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ مَیں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی، مَیں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی

ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا اُن سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی :

تادست رسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم مَیں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑیگی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھُلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، مَیں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرلوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہوسکا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمایش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جاچکی ہیں۔ ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے

آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں۔ اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مَیں نے اِن دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اُتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی۔ اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، جس طرح باتیں کرتا تھا، اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا، وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اُس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملیگی لیکن پھر میں فوراً چونک اُٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے، میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسبِ معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں۔

جیسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا، اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اُس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبّہ نہ لگ جائے!

بدہ یارب دلے، کیں صورتِ بے جاں نمی خواہم!

بالآخر ۹- اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا:

فان ما تحذرین قد وقع

۲- بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی اور اُس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا، اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، لیکن جونہی انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا، تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی، اور اس طرح میرے طریق کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت

کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اس دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے ہیں:

غافل نیم زراہ، ولے آہ چارہ نیست
زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند

یہاں ایک احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے۔ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اُس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہے۔ کل شام کو دیر تک اُسے دیکھتا رہا، اور مُتمّم بن نُویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آ گیا:

لقد لامنی عند القبور علی البکا رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال: ا تبکی کلّ قبر رایتہٗ لقبرٍ ثوی بین اللّوی فالدکاوک؟
فقلت لہٗ: ان الشجا یبعث الشجا فدعنی، فھذا کلّہٗ قبر مالک!

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سُنتے ہوتے تو بول اُٹھتے:

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانہ میں

قلعۂ احمد نگر

۱۴-جون ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

حسبِ حالے نہ نوشتیم و شد ایامے چند
قاصدے کو کہ فرستیم بتو پیغامے چند

گزشتہ سال جب ہم یہاں لائے گئے تھے، تو برسات کا موسم تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور جاڑے کی راتیں شروع ہو گئیں۔ پھر جاڑے نے بھی رختِ سفر باندھا، اور گرمی اپنا ساز و سامان پھیلانے لگی۔ اب پھر موسم کی گردش اسی نقطہ پر پہنچ رہی ہے جہاں سے چلی تھی۔ گرمی رخصت ہو رہی ہے اور بادلوں کے قافلے ہر طرف سے اُمنڈنے لگے ہیں۔ دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہو چکیں، مگر اپنے دل کو دیکھتا ہوں تو ایک دوسرا ہی عالم دکھائی دیتا ہے۔ جیسے اس نگری میں کبھی موسم بدلتا ہی نہیں۔ سرمد کی رباعی کتنی پامال ہو چکی ہے پھر بھی بھلائی نہیں جا سکتی:

سرما بگزشت و ایں دل زار ہماں گرما بگزشت و ایں دل زار ہماں
القصہ تمام سرد و گرم عالم برما بگزشت و ایں دل زار ہماں

یہاں احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے۔ کچھ دن ہوئے،

ایک وارڈر نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی۔ اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا۔ نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اُتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا۔ جس ٹہنی کو دیکھو، ہرے ہرے پتّوں اور سفید سفید پھولوں سے لد رہی ہے۔ لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو گویا اُس کے لئے کوئی انقلابِ حال ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے، اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے:

ہمچو ماہی غیر داغم پوششِ دیگر نہ بود
تا کفن آمد، ہمیں یک جامہ برتن داشتم!

یہ بھی اُسی درخت کی ایک شاخ ہے۔ جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی، مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں، گرمی و سردی، خشکی و طراوت، سب اس کے لئے یکساں ہو گئے!

کل دوپہر کو اُس طرف سے گزر رہا تھا کہ یکایک اس شاخِ بریدہ سے پاؤں ٹھکرا گیا۔ مَیں رُک گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ بے اختیار شاعر کی حسنِ تعلیل یاد آگئی:

قطع امید کردہ نہ خواہد نعیمِ دہر
شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

میں سونچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی امید و طلب کے بےشمار درخت اُگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی۔ ان کے لئے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ کوئی موسم بھی انہیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا!

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

موسمی پھولوں کے جو درخت یہاں اکتوبر میں لگائے تھے، انہوں نے اپریل کے آخر تک دن نکالے، مگر پھر انہیں جگہ خالی کرنی پڑی۔ مئی میں خیال ہوا کہ بارش کے موسم کی طیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ چنانچہ نئے سرے سے تختوں کی درستگی ہوئی۔ نئے بیج منگوائے گئے، اور اب نئے پودے لگ رہے ہیں۔ چند دنوں میں نئے پھولوں سے نیا چمن آراستہ ہو جائیگا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر میرے سامنے رہ رہ کر ایک دوسری ہی بات آ رہی ہے۔ سونچتا ہوں کہ دُنیا کا باغ اپنی گل شگفتگیوں میں کتنا تنگ واقع ہُوا ہے؟ جب تک ایک موسم کے پھول مُرجھا نہیں جاتے، دوسرے موسم کے پھول کِھلتے نہیں۔ گویا قدرت کو جتنا خزانہ لٹانا تھا، لٹا چکی، اب اسی میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک جگہ کا سامان اُٹھایا۔ دوسری جگہ سجا دیا، مگر نئی پونجی یہاں مل سکتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدسی کو پھولوں کا کِھلنا پسند نہیں آیا تھا، اُسے

اندیشہ ہوا تھا کہ اگر باغ کا پھول کھِلے گا، تو اس کے دل کی کلی بند کی بند رہ جائے گی:

عیشِ ایں باغ بہ اندازۂ یک تنگ دل ست
کاش گُل غنچہ شود تا دلِ ما بکشاید!

غور کیجیے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہوتی ہے:

بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی!

میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں مگر اینٹوں کا پزاوہ بھر جاتا ہے۔ درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں مگر جہاز بن کر طیار ہو جاتے ہیں۔ سونے کی کانیں خالی ہو گئیں لیکن ملک کا خزانہ دیکھیے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے۔ مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پا تک بہا دیا مگر سرمایہ دار کی راحت و عیش کا سر و سامان درست ہو گیا۔ ہم مالن کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں، مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی کے باغ کی کیاری اُجڑی ہو گی جبھی تو یہ جھولی معمور ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرفی نے اپنے دامن میں پھول دیکھے تھے تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا:

زمانہ گلشنِ عیشِ کرا بہ یغما داد؟
کہ گل بہ دامنِ ما دستہ دستہ می آید!

اکتوبر سے اپریل تک موسمی پھولوں کی کیاریاں ہماری دلچسپیوں کا مرکز رہیں صبح و شام کئی کئی گھنٹے ان کی رکھوالی میں صرف کر دیتے تھے، مگر موسم کا پلٹنا تھا کہ ان کی حالت نے بھی پلٹا کھایا، اور پھر وہ وقت آ گیا کہ ان کی کھوالی کرنا ایک طرف، کوئی اس کا بھی روادار نہ رہا کہ ان اجل رسیدوں کو چند دن اور ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ ایک ایک کر کے تمام کیاریاں اکھاڑ ڈالی گئیں۔ وہی ہاتھ جو کبھی اونچے ہو ہو کر ان کے سر و سینہ پر پانی بہاتے تھے، اب بے رحمی کے ساتھ ایک ایک ٹہنی توڑ مروڑ کر پھینک رہے تھے۔ جن درختوں کے پھولوں کا ایک ایک ورق حسن کا مرقع اور رعنائی کا پیکر تھا، اب جھلسی ہوئی جھاڑیوں اور روندی ہوئی گھانس کی طرح میدان کے ایک کونے میں ڈھیر ہو رہا تھا، اور صرف اسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ جس کسی ساماں کو جلانے کے لئے لکڑیاں میسر نہ آئیں، وہ انہی کو چولھے میں جھونک کر اپنی ہانڈی گرم کر لے:

گلگونۂ عارض ہے، نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خوں شدہ دل! تو تو کسی کام نہ آیا!

زندگی اور وجود کے جس گوشہ کو دیکھئے، قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ایسے ہی تماشے نظر آئیں گے:

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش ست زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش ست

انسانی زندگی کا بھی بعینہٖ یہی حال ہوا۔ سعی و عمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے، اس کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ جو بیکار ہو جاتا ہے، اُسے چھانٹ دیا جاتا ہے۔ فاما الزبد فیذھب جفاءً و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔[1]

[1] یہ قرآن کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس میں کارخانۂ ہستی کی اس اصل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو چیز نافع ہوتی ہے وہ باقی رکھی جاتی ہے۔ جو بیکار ہو گئی، وہ چھانٹ دی جاتی ہے۔

قلعۂ احمد نگر

۱۵- جون سنہ ۴۳ء

صدیق مکرم عرب کے فلسفی ابو العلاء معرّی نے زمانہ کا پُورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا تھا: کل جو گزر چکا۔ آج جو گذر رہا ہے۔ کل جو آنے والا ہے:

ثلاثۃ ایام ھی الدھر کلّہ وما ھنّ الّا الامس والیوم والغد

وما البدر الا واحد غیر انّہ یغیب ویأتی بالضیاء المجدّد!

لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم "حال" کہتے ہیں، وہ فی الحقیقت ہے کہاں؟ یہاں وقت کا جو احساس بھی ہمیں میسّر ہے، وہ یا تو "ماضی" کی نوعیّت رکھتا ہے یا مستقبل کی، اور انہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے جسے ہم "حال" کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ "ماضی" اور "مستقبل" کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیّت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے، لیکن وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکتے۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں، لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا، اور ادھر اس نے اپنی نوعیّت بدل ڈالی۔ اب یا تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جا چکا، یا "مستقبل" ہے جو ابھی آیا ہی نہیں۔ لیکن

خود "حال" کا کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دیتا جس وقت کا ہم نے پیچھا کرنا چاہا تھا۔ وہ "حال" تھا، اور جو ہماری پکڑ میں آیا ہے، وہ "ماضی" ہے:

نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

شاید یہی وجہ ہے کہ ابو طالب کلیم کو انسانی زندگی کی پوری مدّت دو دن سے زیادہ نظر نہیں آئی:

بدنامیٔ حیات دو روزے نبود بیش
واں ہم کلیم با تو چگویم چساں گزشت
یک روز صرفِ بستنِ دل شد باین و آں
روزے دگر بکندنِ دل زین و آں گزشت

ایک عرب شاعر نے یہی مطلب زیادہ ایجاز بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے:

وما ہی الا ساعۃ ثم تنقضی
یومان یوم نوی و یوم صدود!

اور اگر حقیقتِ حال کو اور زیادہ نزدیک ہو کر دیکھیے تو واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی پوری مدّت ایک صبح شام سے زیادہ نہیں۔ صبح آنکھیں کھلیں، دو پہر امید و بیم میں گزری، رات آئی تو پھر آنکھیں بند تھیں۔ لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاھا:

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ۔ غنودیم!

لیکن پھر غور کیجئے۔ اسی ایک صبح شام کے بسر کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے؟ کتنے صحراؤں کو طے کرنا پڑتا ہے؟ کتنے سمندروں کو لانگنا پڑتا ہے؟ کتنی چوٹیوں پر سے کودنا پڑتا ہے؟ پھر آتش و پنبہ کا افسانہ ہے، برق و خرمن کی کہانی ہے:

دریں چمن کہ ہوا داغِ شبنم آرائی ست
تسلّیے بہ ہزار اضطراب می بافند!